As per new syllabus Andhra Pradesh

جوہرِ ادب

(شاعری، نثر اور قواعد)

و

سرسری مطالعہ

انٹرمیڈیٹ سال اوّل

اُردو برائے زبان دوم Part - II

Study Material
For Intermediate - First Year
Second Language : Part - II









As per new syllabus

Andhra Pradesh

جوہرِ ادب

(شاعری، نثر اور قواعد)

و

سرسری مطالعہ

Study Material

Intermediate - First Year

Second Language

Part - II

by

ڈاکٹر جاوید کمال

M.A.,M.Phil., Ph.D (Osm)



DECCAN TRADERS

Educational Publishers

23-2-378, Moghalpura, Hyd-500 002

☎ : 040-24521777, 66490230, Fax : 66710230

Website : www.deccantraders.co.in

E-mail : dthyd@yahoo.com

فہرست



1

حصۂ شاعری

نظم

مناجات

محمد قلی قطب شاہ

I. مختصر سوالات:

سوال (1) محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

جواب: محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش 1565ء کو گولکنڈہ میں ہوئی۔

سوال (2) اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کسے کہتے ہیں؟

جواب: اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو کہا جاتا ہے جو قطب شاہی دور کا پانچواں بادشاہ تھا۔

سوال (3) محمد قلی قطب شاہ کی وفات کس سنہ میں ہوئی؟

جواب: محمد قلی قطب شاہ کی وفات 1611ء میں ہوئی۔

II. طویل جوابی سوالات

سوال(1) محمد قلی قطب شاہ پر نوٹ لکھیئے؟

جواب: محمد قلی قطب شاہ 1565ء کو گولکنڈہ میں پیدا ہوا۔اس کے والد کا نام ابراہیم قلی قطب شاہ تھا۔محمد قلی، قطب شاہی دور کا پانچواں بادشاہ گزرا ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا اور 1580ء سے لے کر 1611ء تک تقریباً 31 سال اُس نے گولکنڈہ پر حکومت کی۔محمد قلی نے شہر حیدر آباد کی بنیاد ڈالی اور اسے کھلے باغات کا شہر کے طور پر بسایا۔اس کے دور میں گولکنڈہ حکومت نے کافی ترقی کی۔عوام سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

محمد قلی کو شعروادب سے کافی دلچسپی تھی وہ خود بھی شاعر تھا اور عوامی شاعر کی حیثیت سے اپنے عوام کے دلوں پر راج کرتا تھا اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور اسے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ وہ اردو اور تلگو دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے 16 تخلص استعمال کیئے۔ اس کا دربار شعراء، مصنفین، علماء اور فضلا سے بھرا رہتا۔ اس نے فارسی، اردو اور تلگو زبانوں کی دل کھول کر سرپرستی کی۔

محمد قلی نے اس دور میں رائج تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔اور زندگی کے ہر شعبہ اور اس سے متعلق چیزوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

برسات، تہوار، عیدین، شب برأت، ترکاریوں، پھلوں، کنیزوں، محلات اور موسموں پر بھی اس نے نظمیں کہی ہیں۔ اس کی شاعری کی خصوصیت حقیقت پسندی ہے۔ اُس کی شاعری میں نیچرل شاعری کے بیش بہا نمونے ملتے ہیں اسی خصوصیت کی وجہ سے اُس کی شاعری آج بھی زندہ ہے۔

سوال (2) ''مناجات محمد قلی قطب شاہ'' کا خلاصہ لکھیئے؟

جواب: **خلاصہ** : محمد قلی قطب شاہ کی یہ مناجات ایک جامع دعا ہے جس میں اپنے، اپنی حکومت اور رعایا کی بھلائی، ترقی اور فتنہ و شر سے محفوظ رکھنے کی اللہ سے قلی قطب شاہ دعا کر رہا ہے۔ اس نے شہر حیدرآباد بسایا تھا اور یہ بھی دعا کی تھی کہ اس کے اس نئے بسائے ہوئے شہر کو لوگوں سے معمور کر دے یعنی آباد کر دے۔

محمد قلی قطب شاہ دعا کر رہا ہے کہ اے سننے والے میرے خدا تو میری دعا سن لے مجھے رات دن خوش رکھ، غموں سے یا پریشانیوں سے دور رکھ۔ میرے حق میں جو اچھا ہو وہی میرے لئے عطا فرما اور جو میرے حق میں بُرا ہے اس سے مجھے محفوظ رکھ۔ میرے چاہنے والوں اور دوستوں کو تو جنت عطا کر کیونکہ وہ میری بھلائی چاہتے ہیں اور میرا بُرا چاہنے والوں کو دوزخ کے حوالے کر یعنی سلطنت کو بُری نظروں سے دیکھنے والے دشمنوں کو آگ کے حوالے کر دے۔ پھر کہتا ہے کہ تمام سلطنتوں کے تختِ شاہی میں، میرے تخت کو، میری سلطنت کو اپنے کرم و مہربانی سے ایسا چمکا دے

جیسے انگوٹھی میں نگینہ چمکتا ہے۔

سلطنت میں چاروں طرف امن وامان اور خوشحالی عطا کر۔ محمد قلی نے شہر حیدر آباد کی بنیاد رکھی اور اس نئے شہر کو لوگوں سے معمور کر دینے کی بھی دعا کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دریا میں جس طرح لاتعداد مچھلیاں ہوتی ہیں شہر حیدر آباد بھی لوگوں سے ایسے ہی بھر دے۔ کس طرح تو نے تمام مُرادیں پوری کر دیں تمام آرام و آسائشوں پر قطب شاہ کو اختیار دے رکھا ہے اُسی طرح اُن پر قابو رکھنے پر قدرت عطا کر اور ان آسائشوں کا صحیح استعمال کرنے کی توفیق عطا کر۔ ائے دعاؤں کے سننے والے قبول کرنے والے تو میری بھی دعا سن لے۔



2

ایک پہاڑ اور گلہری

علامہ اقبالؔ

I. مختصر سوالات کے جوابات:

سوال (1) علامہ اقبالؔ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

جواب: علامہ اقبالؔ 9 / نومبر 1877ء کو پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

سوال (2) علامہ اقبالؔ کے کوئی دو اردو شعری مجموعوں کے نام لکھیئے۔

جواب: علامہ اقبالؔ کے اردو شعری مجموعوں کی تعداد چار ہے جن میں ''بانگ درا'' اور ''بالِ جبریل'' شامل ہیں۔

سوال (3) علامہ اقبالؔ کو انگریزوں کی جانب سے کونسا خطاب دیا گیا؟

جواب: علامہ اقبالؔ کو انگریز حکومت کی جانب سے ''سَر'' کا خطاب دیا گیا تھا۔

سوال (4) علامہ اقبالؔ کی وفات کہاں اور کب ہوئی؟

جواب: علامہ اقبالؔ کا انتقال 21 / اپریل 1938ء کو لاہور میں ہوا۔

II. طویل سوالات:

سوال(1) علامہ اقبالؔ کا تعارف اپنے الفاظ میں کرائیے؟

جواب: علامہ اقبالؔ کے بزرگ کشمیری برہمن تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا خاندان کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہوگیا۔ یہیں سیالکوٹ میں 9/نومبر 1877ء کو اقبالؔ پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ حالانکہ اقبالؔ کے والدین زیادہ تعلیمیافتہ نہیں تھے مگر انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت پر خاص توجہ کی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا اسی لئے اقبالؔ کو کم عمری میں دینی تعلیم کے حصول کے لئے مکتب میں داخل کرادیا گیا۔ شیخ نور محمد کے دوست سید میر حسن نے مشورہ دیا کہ اقبالؔ کی تعلیم صرف دینی تعلیم تک محدود نہیں ہونی چاہیے انہیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کرنی چاہیے۔ سید میر حسن سے ہی اقبالؔ ان زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں اسکاچ مشن اسکول میں اقبالؔ کو داخل کرادیا گیا۔ 1891ء میں مڈل اور 1893ء میں میٹرک امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ پھر انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد بی۔اے کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ بی۔اے پھر ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان گئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد مختلف کالجوں میں پیشۂ تدریس کی خدمات انجام دیں اور بعدازاں وکالت کے پیشہ سے وابستہ ہوئے۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت برطانیہ نے اُنہیں ''سر'' کے

خطاب سے نوازا۔

اقبالؔ اردو اور فارسی کے ممتاز اور منفرد، شاعر تھے۔ بحیثیت فلسفی شاعر انہوں نے اپنے فلسفے سے ملت اسلامیہ کے درد کی دوا کی۔ وہ ایشیائی قوم اور بالخصوص مسلمانوں کو مایوسی اور ذلّت کے اندھیروں سے نکال کر عزت ووقار، قدر و منزلت کی اونچائیوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

اقبالؔ پیامی شاعر ہیں لیکن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ پیرائے اظہار میں دلکشی نہ ہو تو فلسفہ و پیغام کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اسی لیئے انہوں نے اپنے پیغام کو کسی اہم ہستی کی زبان سے ادا کر کے زیادہ پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔ کہیں خضر کی زبان استعمال کرتے ہیں تو کہیں جبرائیل کی، کہیں لینن کی تو کہیں سرسید کی۔ اقبالؔ نے بچوں کے لئے بھی کافی نصیحت آموز نظمیں لکھی ہیں اور ترجمہ بھی کی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں خودی اور عشق کے فلسفے کو بڑی مہارت اور خوش اسلوبی کے ساتھ عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ شعر کیلئے نغمگی بہت ضروری ہے اور اقبالؔ کے کلام میں ترنم بہت زیادہ ہے۔ وہ بحروں کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں، لفظوں کے انتخاب میں بھی وہ بڑی ہنرمندی سے کام لیتے ہیں۔ صنائع کا ہنرمندانہ استعمال بھی ان کی شاعری میں کیا گیا ہے۔

اقبالؔ نے ابتداء میں داغؔ سے اپنی غزلوں پر اصلاح لی۔ اقبالؔ نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کتابیں لکھیں۔ نصاب میں شامل اُن کی نظم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' اُن کے مجموعہ کلام بانگ درا سے اخذ کی گئی ہے۔ بانگ درا، بال

جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز اُن کے اردو شعری مجموعے ہیں۔

اقبالؔ کا انتقال 21/ اپریل 1938ء کو لاہور (پاکستان) میں ہوا۔

سوال (2) نظم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' کا خلاصہ لکھیئے۔

جواب: **خلاصہ**: ''ایک پہاڑ اور گلہری'' علامہ اقبالؔ کی لکھی ہوئی ایک ایسی نظم ہے جس میں علامہ اقبالؔ نے پہاڑ اور گلہری کے پیرائے میں یہ پیام دینے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ جتنی بھی چیزیں تخلیق کی ہیں چاہے وہ انسان ہو، جانور یا پرندے ہوں یا پھر پہاڑ اور دوسری بے جان چیزیں اُن سب سے خدا کی قدرت نمایاں ہیں۔ ایک چیز کی خصوصیت دوسرے میں نہیں اور دوسرے کی تیسرے میں نہیں۔ ہر چیز میں اللہ نے الگ الگ خصوصیات اور خوبیاں رکھی ہیں۔ کسی کو بہت چھوٹا بنادیا تو کسی کو بہت بڑا۔ لیکن چھوٹا اور بڑا بنانے میں بھی اللہ کی حکمت یا مصلحت پوشیدہ ہے۔

اپنی اس نظم ایک ''پہاڑ اور گلہری'' میں اسی اہم نکتہ کو پہاڑ اور گلہری کی گفتگو کے ذریعہ بچوں اور بڑوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ایک پہاڑ جو جسامت میں بہت بڑا ہوتا ہے۔ اپنے بڑے پن کے غرور وتکبر میں گلہری کو شرم سے مرجانے کا مشورہ دیتا ہے کیونکہ اُسے لگتا ہے کہ گلہری چھوٹا سا جانور ہونے کے باوجود اس میں عقل اور شعور ہوتا ہے اور وہ اپنے چلنے پھرنے، پیڑ پر چڑھنے اور اپنے انداز سے خود کو تمیز والی ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور

اس کا اس طرح کا انداز پہاڑ کو پسند نہیں آتا اور گلہری سے کہتا ہے کہ میری شان بان کے آگے تیری کوئی حیثیت نہیں ہے تُو تو کیا زمین بھی مری آن بان کے آگے چھوٹی یا کمتر نظر آتی ہے جبکہ تُو تو ایک ادنیٰ سی چھوٹی سی جانور ہے۔ مجھے اللہ نے جو بڑائی عطا کی ہے وہ تجھے نصیب نہیں ہے۔

پہاڑ کا اس طرح اپنی بڑائی اور شان بیان کرنے اور گلہری کو چھوٹا اور بے نصیب جانور کہنے پر گلہری اس سے کہتی ہے کہ جو کچھ تو اپنے اور میرے بارے میں کہہ رہا ہے اُن باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور انہیں تُو اپنے دل سے نکال دے کہ تُو بڑا ہے اور میں بہت چھوٹی ہوں۔ میں بڑی نہیں ہوں اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن تُو بھی تو میری طرح چھوٹا نہیں ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ ہر چیز چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس سے خدا کی قدرت جھلکتی ہے اور اسی طرح چھوٹا اور بڑا بنانے میں اس کی دانائی یا مصلحت چھپی ہوئی ہے۔ گلہری اسکی مثال دیتے ہوئے کہتی ہے کہ تجھے صرف بڑا بنا دیا ہے لیکن مجھے درخت پر چڑھنا سکھا دیا۔ جبکہ تو ایک قدم بھی اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا کیا یہی تیری بڑائی ہے جس پر تو غرور کر رہا ہے۔ گلہری، پہاڑ کو چیلنج کر کے کہتی ہے کہ اگر تو بڑا ہے تو میرے جیسا ہنر دکھا یعنی یہ چھالیہ ہی توڑ کر دکھا دے۔ پھر کہتی ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ تو اس ہنر سے محروم ہے تو پھر کیوں اپنے بڑے اور شان والا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ یاد رکھ زمانے میں کوئی چیز بے کار یا چھوٹی نہیں ہوتی۔ قدرت نے اپنی بنائی اس دنیا میں

ہر چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی یا بڑائی پوشیدہ رکھی ہے اسی لئے یہاں کوئی چیز بُری یا بیکار نہیں ہے۔

اقبالؔ اپنی اس نظم کے ذریعہ لوگوں کو یہ پیام دینا چاہتے ہیں کہ انسان کو کسی حال میں غرور یا تکبر نہیں کرنا چاہیے۔ نا اپنے دولت مند ہونے پر نا خوبصورتی پر اور نہ اپنے عہدے پر۔ کسی کو غریب کسی کو امیر، کسی کو خوبصورت تو کسی کو عام صورت کا مالک بنایا ہے تو اس میں اللہ کی حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ دولت مند ہونے پر نہ غرور کرنا چاہیے اور نہ غریب ہونے پر ناشکری۔ یہی اس نظم کا پیام ہے۔



3

اے شریف انسانو !

ساحؔر لدھیانوی

❖ مختصر سوالات:

سوال (1) ساحؔر لدھیانوی کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: ساحؔر لدھیانوی جن کا اصل نام عبدالحئی تھا۔ 1922ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔

سوال (2) ساحؔر لدھیانوی کی وفات کب ہوئی؟

جواب: ساحر لدھیانوی کی وفات 1980ء کو ممبئی میں ہوئی۔

سوال (3) کالج کے زمانے میں ساحؔر لدھیانوی کن جریدوں کے ایڈیٹر رہے؟

جواب: کالج کے زمانے میں ساحؔر لدھیانوی ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' کے ایڈیٹر رہے۔

سوال (4) نظم ''شریف انسانو!'' کس پس منظر میں لکھی گئی؟

جواب: نظم ''اے شریف انسانو!'' ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی۔

• طویل سوالات

سوال(1) ساؔحر لدھیانوی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: ساؔحر لدھیانوی کا اصل نام عبدالحئی تھا اور ساؔحر تخلص کرتے تھے۔ اُن کی پیدائش 1922ء میں لدھیانہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم لدھیانہ میں حاصل کی۔ ماں باپ میں کشیدگی کی وجہ سے علیحدگی ہوگئی تھی۔ ساؔحر اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ پرورش کی ذمہ داری ماں اور ماموں نے پوری کی۔ کچھ عرصہ بعد لاہور چلے گئے اور وہاں سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور ادبی زندگی کا آغاز بھی کالج ہی کے زمانے سے ہوا۔ وہاں ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' کے ایڈیٹر رہے۔ بعد میں دہلی آئے اور کچھ مدت ''شاہراہ'' کے مدیر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد ساؔحر کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ روزگار کی تلاش میں بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کی۔ ان کے فلمی گانوں کو بہت زیادہ شہرت ملی۔ اسی زمانے میں ان کے مجموعے کلام ''تلخیاں'' کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

ساؔحر لدھیانوی کو غزل کے علاوہ نظم، گیت اور دوسری اصناف پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ''تلخیاں'' کے علاوہ ایک اور مجموعہ ''گاتا جائے بنجارہ'' بھی شائع ہوا۔ ''پرچھائیاں'' کے نام سے ایک طویل نظم بھی کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ بعد میں یہ نظم ''آؤ کہ کوئی خواب بُنیں'' مجموعہ میں شامل کرلی گئی۔

ساؔحر لدھیانوی کی شاعری میں بے ساختگی اور تغزل کی کیفیت پائی جاتی

ہے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے اور لہجے میں شادابی اور رنگینی موجود تھی۔ ان کے کلام میں فکری گہرائی نہیں ملتی لیکن احساس کی دلکشی پائی جاتی ہے اور یہی ان کی شاعری کی مقبولیت کا راز ہے۔ ساحؔر کی شاعری میں جذباتی بہاؤ کی کیفیت اور شیرینی ہے۔ جو براہِ راست نوجوانوں کو راغب کرتی ہے۔ انہوں نے سماجی، سیاسی مسائل پر بھی دلکش انداز میں لکھا ہے۔ ان کی شاعری میں تصنع یا تکلف بالکل بھی نہیں پایا جاتا۔ ساحؔر نے جوانی کے تجربات کو بڑے سلیقے سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اُن کی نظم ''اے شریف انسانو!'' امن کے موضوع پر لکھی گئی ایک متاثر کن نظم ہے۔

سوال (2) نظم ''اے شریف انسانو!'' کا خلاصہ لکھیئے۔

جواب: نظم ''اے شریف انسانو!'' ساحؔرلدھیانوی کی لکھی ہوئی ہے۔ اپنی نظم میں ساحؔر نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوئی جنگ اور اس کے خطرناک نتائج کو بڑے ہی مؤثر اور ناصحانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی اس نظم میں جنگ سے اور اس کے بعد پیدا ہونے والے خطرناک حالات سے بچنے اور امن قائم رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ کے کئی میدان ہیں جیسے وحشت سے اور بربریت سے جنگ کر کے امن، تہذیب و ترقی کو بڑھا وادے سکتے ہیں۔ گندی سیاست کے خلاف، افلاس اور غلامی کے خلاف جنگ کی جا سکتی ہے اور امن کے ساتھ بہتر نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں معمولی زمین کے ٹکڑے کیلئے، اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے اور اپنے گھروں میں روشنی کرنے کے لئے جنگیں ہو رہی ہیں، نسل آدم کا خون بہایا جا رہا ہے، اپنی فتح کا جشن منایا جا رہا ہے۔

شریف انسانوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ خون تو خون ہے چاہے اپنا ہو یا پرایا۔ جنگ چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں، بم گھروں پر گریں یا سرحدوں پر، کھیت چاہے کسی کے جلیں یا پھر جنگ کے جیت جانے کا جشن منایا جائے یا ہار جانے کا سوگ ان سب کے پیچھے صرف اور صرف تباہی و بربادی اور آدمی کا خون بہتا ہے۔ معیشت تباہ ہوتی ہے، زمین کھیتی کے قابل نہیں رہتی۔ گھروں میں اندھیرا چھا جاتا ہے اور لوگ فاقوں سے مرتے ہیں۔ تباہی و بربادی کے اثرات مٹنے میں اور زندگی کو معمول پر لانے میں برسوں بیت جاتے ہیں تو پھر ساؔحر لدھیانوی کی نظر میں ایسی جنگوں سے کیا فائدہ؟ شاعر کہتے ہیں کہ اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے انسانی خون بہانا ضروری نہیں بلکہ برتری ثابت کرنے کے لئے مختلف انسان دشمن قوتوں کا خاتمہ کر کے، اپنے ملک میں پائیدار امن وسکون پیدا کر کے، ایک بہتر نظام قائم کر کے بھی برتری ثابت کی جاسکتی ہے۔

ساؔحر لدھیانوی کہتے ہیں کہ اس اندھیرے کی حامل دنیا میں فکر کی روشنی کو عام کرنا چاہیے۔ امن کو تقویت پہنچانے والی جنگ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جنگوں کا جو موجودہ فلسفہ ہے اس کے خلاف جنگ کرنا چاہیے۔

غرض ساؔحر لدھیانوی خونی جنگوں سے بچنے کا مشورہ دیتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ انسانوں اور انسانیت کی بھلائی کیلئے جنگ کر کے ملک کی ترقی اور سارے عالم میں امن کا ماحول پیدا کرنے کیلئے کوشش کرنی چاہئے۔



4

غزل

میر تقی میر

● سوالات:

سوال(1) ذیل کے اشعار کی تشریح کیجیے۔

(1) جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

تشریح: یہ شعر میر تقی میر کی غزل کا مطلع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ کسی چیز کو بھی ثبات نہیں سوائے اللہ کی ذات کے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، گورا ہو یا کالا، طاقتور ہو یا کمزور سب کو مرمٹنا ہے۔ جو لوگ اپنی طاقت، اپنی دولت، اپنے حسن و جمال یا پھر اپنے تخت و تاج پر غرور کرتے ہیں یا غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ یہ چیزیں ہمیشہ رہنے والی ہیں تو اُنہیں یاد رکھنا چاہیے جس سر پر آج تاج ہونے کی وجہ سے وہ غرور کر رہا ہے کل وہی سر مٹی میں مل جانے والا ہے اور اس سر پر لوگ ماتم کر رہے ہوں گے۔ غرور، گھمنڈ، اور حسن و شباب سب مٹی میں مل جائے گا۔ اسی لئے شاعر غرور کرنے سے منع کر رہا ہے۔

(2) لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

تشــریح: دیا گیا شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ دنیا ایک نازک مقام اور دنیا کی زندگی انتہائی نازک کام ہے انسان کو بہت سوچ سمجھ کر زندگی گزارنا چاہیے کیونکہ ذراسی بھی لغزش اُسے دنیاوی امتحان میں ناکام کرسکتی ہے۔ دنیا ایک شیشہ گری کا مقام ہے یہاں سانس بھی آہستہ لینا چاہیے ورنہ زندگی کے شیشہ میں خراش یا دھبے آکر اُسے بدنما بناسکتے ہیں اوراُسے بے قیمت کرسکتے ہیں۔

سوال (2) غزل کی تعریف کیجیے اور کسی دو شعراء کے نام لکھیئے۔

جواب: غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا کے ہیں۔لیکن جدید دور میں غزل میں نئے نئے موضوعات داخل کر کے اس کے دامن کو بہت وسیع کردیا گیا ہے۔اردو شاعری میں غزل کی روایت زمانہ قدیم سے رہی ہے۔قدیم اردو یا دکنی شاعری میں بھی غزل کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ولیؔ اورنگ آبادی نے غزل کے فن کو باقاعدگی بخشی اوراس صنف کو شمالی ہند میں بھی متعارف کروایا۔اس طرح شمالی ہند کے شعراء نے اردو غزل کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔اس کے خط وخال میں دور کے اُتار چڑھاؤ کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں جو مقبولیت غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی اور

صنفِ سخن کے حصہ میں نہیں آئی۔ غزل کا فن نہایت ہی لطیف اور نازک ہے اس لیئے اس میں جذبہ اور خیال کی مکمل ہم آہنگی ضروری ہے۔ غزل کا فن اشارے کنائے کا فن ہے اور بے حجابی اس کے مزاج کے خلاف ہے۔

دبستان دہلی کے برخلاف دبستان لکھنؤ نے اس فن کو ٹھیس پہنچائی جس کی وجہ سے غزل میں معاملہ بندی وخارجی لوازمات در آئے اور غزل میں چٹخارے کا عنصر پیدا ہوگیا۔

1857ء کے انقلاب کے بعد اردو ادب اور غزل میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جدید غزل کا آغاز ہوا۔ حاؔلی نے غزل کی روایت میں زندگی کے مسائل کو شامل کر کے اُس کو ایک نیا مزاج عطا کرنے کی شعوری طور پر کوشش کی اور اس طرح جدید اردو غزل کا ارتقاء ہوا۔

غزل میں کم سے کم پانچ شعر اور زیادہ سے زیادہ پچیس شعر کی گنجائش ہوتی ہے۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع اور آخری شعر کو جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہا جاتا ہے۔ غزل کے لئے قافیہ اور ردیف کا لزوم ہوتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنے جدا معنی رکھتا ہے مرزا غاؔلب، میر تقی میر، شیخ ابراہیم ذوؔق، مومن خاں مومؔن، ولؔی دکنی اور حسرت موہانی غزل کے مشہور شعراء گزرے ہیں۔

سوال (3) میؔر کے شعری اسلوب کے اہم نکات بیان کیجیے۔

جواب: میر تقی میؔر اردو کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں اور ان کی شاعرانہ

عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں ''خدائے سخن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
قدرت نے میؔر کو نہایت حساس دل عطا کیا تھا اور اُن کی زندگی مصائب ومشکلات
سے بھری ہوئی تھی۔اسی لیے اُن کی شاعری میں زندگی سے مایوسی اور غم والم کے
احساسات بہت زیادہ اور نمایاں طور پر محسوس کیئے جاسکتے ہیں۔

میؔر کو زبان پر قدرت حاصل تھی ۔ان کے اشعار میں سادگی وصفائی پائی
جاتی ہے اسی لیئے وہ سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ بظاہر سہل ممتنع معلوم ہوتے
ہیں لیکن معنوی اعتبار سے ان میں بڑی گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ ان کی
غزلیں عشق سے بھرپور دل کی وارداتوں کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔

میؔر کے کلام میں سوز وگداز، خستگی ،نشتریت، رنگینی،سلاست ، شیرینی اور
شوخی بدرجہ اتم موجود ہے۔ کہیں کہیں طنز اور تنقید کا پہلو بھی نمایاں طور پر محسوس کیا
جاسکتا ہے۔ میؔر نے زندگی سے جو کچھ حاصل کیا اور دل پر جو کیفیات گزریں اُسے
پوری ایمانداری سے غزل کے پیکر میں ڈھال دیا۔تغزل کو انہوں نے جس کامیابی
اور خوش اسلوبی سے نبھایا وہ میؔر ہی کا حصہ ہے۔

مجموعی اعتبار سے میؔر کا ہلکا پھلکا سبک اور رواں انداز اور بعض اوقات
الفاظ کی تکرار اور خوبصورت تشبیہات واستعارے ان کے کلام میں حُسن پیدا کر
دیتے ہیں یہی خصوصیت ان کو ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

• اشعار کی تشریح

(1) جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

تشریح: یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل کا مطلع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ کسی چیز کو بھی ثبات نہیں سوائے اللہ کی ذات کے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، گورا ہو یا کالا، طاقتور ہو یا کمزور سب کو مرمٹنا ہے۔ جو لوگ اپنی طاقت، اپنی دولت، اپنے حسن و جمال یا پھر اپنے تخت و تاج پر غرور کرتے ہیں یا غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ یہ چیزیں ہمیشہ رہنے والی ہیں تو اُنہیں یاد رکھنا چاہیے جس سر پر آج تاج ہونے کی وجہ سے وہ غرور کر رہا ہے کل وہی سر مٹی میں مل جانے والا ہے اور اس سر پر لوگ ماتم کر رہے ہوں گے۔ غرور، گھمنڈ، اور حسن و شباب سب مٹی میں مل جائے گا۔ اسی لئے شاعر غرور کرنے سے منع کر رہا ہے۔

(2) آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

تشریح: دیا گیا شعر میر تقی میرؔ کی غزل کا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ یہ دنیا فنا ہونے والی جگہ ہے اور انسان کیلئے امتحان گاہ۔ اس امتحان سے پوری طرح کامیاب ہو جانا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ منزل کو پانے کے لئے اسباب سفر لٹانا پڑتا ہے۔

مشکلات اور روکاوٹوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اس دنیا سے صحیح سلامت کوئی بھی نہیں جاسکتا۔ ہرانسان کواپنی جان مالکِ حقیقی کے سپرد کرکے آخرت کی منزل کی طرف رواں دواں ہونا پڑتا ہے۔

(3) زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

تشریح: یہ شعر میر تقی میرؔ کا ہے۔شاعر کہتے ہیں کہ محبوب کے عشق اوراُس کے فراق کی وجہ سے ہمارے جنوں میں اوراضافہ ہوگیااور ہمیں زنداں میں قید کردیا گیالیکن یہاں بھی ہماری دیوانگی اور بے قراری نہ گئی۔ لگتا ہے کہ اس دیوانگی کااب بس ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ زنداں کے پتھروں سے اپنا سرٹکرا کراپنی دیوانگی کا خاتمہ کرلیں۔

(4) لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

تشریح: دیا گیا شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ دنیا ایک نازک مقام اوردنیا کی زندگی انتہائی نازک کام ہے انسان کو بہت سوچ سمجھ کرزندگی گزارنا چاہیے کیونکہ ذراسی بھی لغزش اُسے دنیاوی امتحان میں ناکام کرسکتی ہے۔ دنیاایک شیشہ گری کا مقام ہے یہاں سانس بھی آہستہ لیناچاہیے ورنہ زندگی کے شیشہ میں خراش یادھبے آکراُسے بدنما بناسکتے ہیں اوراُسے بے قیمت کرسکتے ہیں۔

(5) ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

تشریح: دیا گیا شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے منتخب کیا گیا ہے۔

یہ غزل کا مقطع ہے جس میں شاعر کہتے ہیں اے میرؔ عشق میں جلے ہوئے اپنے جگر کی جلدی سے خبر لو کیونکہ یہ پوری طرح جل چکا ہے اور کبھی بھی چراغ سحری کی طرح گل ہو جا سکتا ہے۔ اس کیفیت میں کم سے کم اس سے ہمدردی کا اظہار کر کے اس کے سوز میں ٹھنڈک پہنچائی جائے۔



5

غزل

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

- **سوالات**

(1) مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

(1) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

تشریح : یہ شعر مرزا غالبؔ کی غزل کا مطلع ہے جس میں شاعر کہتا ہے کہ میرے دل میں ہزاروں ارمان یا خواہشیں ہیں اور ہر خواہش بہت ہی اہم لگتی ہے اور دل اس پر مٹا جاتا ہے وہ کہتے ہیں حالانکہ بہت ساری خواہشیں پوری ہو چکی ہیں لیکن نفس پرستی اور ہوس پرستی ایک ایسی بُری بلا ہے جس سے انسان کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ زندگی میں سب کچھ حاصل ہو جانے کے بعد بھی ہوس پرست انسان کو ایسا لگتا ہے کہ ابھی بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ کاش کچھ اور ارمان پورے ہو جاتے تو زندگی مکمل ہو جاتی۔ اس طرح خواہشات کا سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہتا ہے اور انسان کبھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہو پاتا۔ کہا جاتا ہے کہ آدمی کی حرص و ہوس قبر کی مٹی سے پوری ہوتی ہے۔ یہی کچھ اس شعر میں شاعر کہنا چاہتے ہیں۔

(2) نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

تشریح: دیا گیا شعر مرزا غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہم اب تک یہ سنتے آئے تھے کہ آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود وہ ممنوعہ پھل کھالیا تھا۔ اسی نافرمانی کی سزا کے طور پر آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ غالبؔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں تیری گلی سے مجھے بے عزت کر کے نکال دیا گیا تو بے ساختہ آدم کا جنت سے نکالا جانا مجھے یاد آ گیا۔ حالانکہ نہ آدم کا قصور اتنا سنگین تھا اور نہ ہی میرا قصور لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے محبوب کے در سے نکال دیئے گئے۔

مرزا غالبؔ نے اپنے اس شعر میں صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے۔

سوال (2) غالبؔ کے حالات زندگی پر ایک نوٹ لکھیئے؟

جواب: غالبؔ کا اصل نام مرزا اسداللہ خاں تھا مرزا نوشہ لقب اور نجم الدولہ، دبیرالملک، نظام جنگ خطاب تھا۔ پہلے اسدؔ اور بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ مرزا غالبؔ کی پیدائش 1797ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی۔ غالبؔ کے آبا و اجداد وسط ایشیاء سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ وہ سپاہی پیشہ تھے۔ غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خاں، مہاراجہ بختاور سنگھ کے ملازم تھے۔ کسی لڑائی میں وہ مارے گئے اور مرزا غالبؔ 5 سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے

غالبؔ کی پرورش کی لیکن بدقسمتی سے چار سال بعد چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ غالبؔ کا ننھیال خوشحال تھا وہیں اُن کی پرورش بڑے عیش و آرام سے ہوئی۔ تیرہ سال کی عمر میں اُن کی شادی دہلی کے نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوگئی اور مرزا غالبؔ مستقل طور پر دہلی منتقل ہوگئے۔ دہلی آنے کے بعد اُن کے شاعری کے ذوق میں اضافہ ہوگیا اور عزت افزائی ہونے لگی۔

غالبؔ نے ہندوستان میں فارسی شاعری کو محترم مقام دلوایا۔ وہ خود اپنی اردو شاعری سے زیادہ فارسی شاعری پر ناز کیا کرتے تھے لیکن غالبؔ کو شہرت اُن کی اردو شاعری کی وجہ سے ملی۔ اُن کی شاعری میں زندگی اور اس سے متعلق تمام تجربات کا نچوڑ ملتا ہے۔

مرزا غالبؔ کی بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار تک رسائی حاصل ہوگئی اور وہ لال قلعہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں اپنے کلام سے دھوم مچانے لگے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے انہیں اپنا استاد مقرر کیا۔ اور انہیں ''تاریخ تیموریہ'' لکھنے کی ذمہ داری سونپی اور پچاس روپئے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔

مرزا غالبؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ اردو غزل کو فکر وفن کی گہرائی عطا کی۔ انہیں اردو غزل میں فکری رجحانات کا بانی مانا جاتا ہے۔ غالبؔ کی گفتگو اور شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے۔ بات میں بات پیدا کرنے کے فن سے خوب واقف تھے۔ ان کے بے شمار برجستہ لطائف بھی

مشہور ہیں۔ مرزا غالبؔ کو حیوان ظریف بھی کہا جاتا ہے۔

شاعری کے علاوہ مرزا غالبؔ کے خطوط بھی جدید اردو نثر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اردو ادب میں اپنی شاعری اور خطوط نویسی کی وجہ سے ہمیشہ زندہ ہیں گے۔ غالبؔ کا انتقال 1869ء میں ہوا اور دہلی میں درگاہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے احاطے میں اُن کی تدفین عمل میں آئی۔

سوال (3) غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

جواب: مرزا غالبؔ ایک ذہین اور صاحب فکر انسان تھے۔ ان کے کلام میں عشق ومحبت اور مشاہدات واحساسات کے علاوہ زندگی کے حقائق کی بڑی گہری بصیرت ملتی ہے۔ وہ نہ صرف اردو فارسی کے بڑے شاعر تھے بلکہ ان کا شمار عالمی ادب کے چوٹی کے شعراء حافظؔ، سعدیؔ، گوئیٹے، شیکسپیئرؔ اور کالی داس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں جیسے انگریزی، فرنچ، روسی اور دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے۔

غالبؔ کی شاعری کے مطالعہ سے ان کی حکیمانہ بصیرت آشکار ہوتی ہے۔ غالبؔ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے ان کی غزلیات میں جذبے کی حرارت کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی، مشاہدات کی تازگی اور انفرادیت ہر جگہ نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

غالبؔ ابتداء میں بڑے مشکل پسند شاعر تھے۔ ان کے ابتدائی زمانے

کے کلام میں فارسیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ابتداء میں غالبؔ نے کلاسیکی شعراء کی تقلید میں پیچیدہ سے پیچیدہ تراکیب کے ساتھ ادق الفاظ کے استعمال اور تشبیہات واستعارے کے کثرت کے ساتھ استعمال کی وجہ سے اپنی شاعری کو مشکل بنادیا تھا جو عام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھی لیکن جوں جوں ان کا شعور پختہ ہوتا گیا اور زمانے کی روش کو سمجھنے لگے اور اپنا ایک انفرادی رنگ اختیار کیا۔ اس طرح ان کی شاعری مشکل پسندی سے نکل کر آسان ہوتی گئی۔

غالبؔ کی غزل گوئی کا امتیازی وصف حسن وعشق کے جذبات کی ترجمانی ہے جس پر انہیں مکمل دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے فلسفہ وفکر اور صوفیانہ افکار و خیالات کے ساتھ اخلاقی اور حکیمانہ بصیرت کی ترجمانی کے ذریعہ اپنی غزلوں میں ہمہ رنگی پیدا کردی۔ غالبؔ کا تفکر اور فلسفہ ہی دراصل ان کی عظمت کا راز ہے۔

- **اشعار کی تشریح**

(1) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تشریح: یہ شعر مرزا غالبؔ کی غزل کا مطلع ہے جس میں شاعر کہتا ہے کہ میرے دل میں ہزاروں ارمان یا خواہشیں ہیں اور ہر خواہش بہت ہی اہم لگتی ہے اور دل اس پر مٹا جاتا ہے وہ کہتے ہیں حالانکہ بہت ساری خواہشیں پوری ہوچکی ہیں لیکن

نفس پرستی اور ہوس پرستی ایک ایسی بُری بلا ہے جس سے انسان کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ زندگی میں سب کچھ حاصل ہو جانے کے بعد بھی ہوس پرست انسان کو ایسا لگتا ہے کہ ابھی بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ کاش کچھ اور ارمان پورے ہو جاتے تو زندگی مکمل ہو جاتی۔ اس طرح خواہشات کا سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہتا ہے اور انسان کبھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہو پاتا۔ کہا جاتا ہے کہ آدمی کی حرص و ہوس قبر کی مٹی سے پوری ہوتی ہے۔ یہی کچھ اس شعر میں شاعر کہنا چاہتے ہیں۔

(2) نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

تشریح: دیا گیا شعر مرزا غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہم اب تک یہ سنتے آئے تھے کہ آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود وہ ممنوعہ پھل کھا لیا تھا۔ اسی نافرمانی کی سزا کے طور پر آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ غالبؔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں تیری گلی سے مجھے بے عزت کر کے نکال دیا گیا تو بے ساختہ آدم کا جنت سے نکالا جانا مجھے یاد آ گیا۔ حالانکہ نہ آدم کا قصور اتنا سنگین تھا اور نہ ہی میرا قصور لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے محبوب کے در سے نکال دیئے گئے۔

مرزا غالبؔ نے اپنے اس شعر میں صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے۔

نفس پرستی اور ہوس پرستی ایک ایسی بُری بلا ہے جس سے انسان کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ زندگی میں سب کچھ حاصل ہو جانے کے بعد بھی ہوس پرست انسان کو ایسا لگتا ہے کہ ابھی بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ کاش کچھ اور ارمان پورے ہو جاتے تو زندگی مکمل ہو جاتی۔ اس طرح خواہشات کا سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہتا ہے اور انسان کبھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہو پاتا۔ کہا جاتا ہے کہ آدمی کی حرص وہوس قبر کی مٹی سے پوری ہوتی ہے۔ یہی کچھ اس شعر میں شاعر کہنا چاہتے ہیں۔

(2) نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

تشریح : دیا گیا شعر مرزا غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہم اب تک یہ سنتے آئے تھے کہ آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود وہ ممنوعہ پھل کھالیا تھا۔ اسی نافرمانی کی سزا کے طور پر آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ غالبؔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں تیری گلی سے مجھے بے عزت کر کے نکال دیا گیا تو بے ساختہ آدم کا جنت سے نکالا جانا مجھے یاد آ گیا۔ حالانکہ نہ آدم کا قصور اتنا سنگین تھا اور نہ ہی میرا قصور لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے محبوب کے در سے نکال دیئے گئے۔

مرزا غالبؔ نے اپنے اس شعر میں صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے۔

(3) مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تم ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر دَھر کر قلم نکلے

تشریح: یہ شعر مرزا غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں اگر کسی کو محبوب کو خط لکھوانا ہو تو مجھ سے لکھوائے کیونکہ میں اس کام میں ماہر ہوں اور صبح سے شام تک یہی کام کرتا پھرتا ہوں۔ اس شعر میں رشک کا پہلو نمایاں ہے اور غالبؔ کو شک ہے کہ کہیں کوئی ان کے محبوب کا چاہنے والا تو نہیں ہے۔ وہ لکھنے کے بہانے اس بات کا پتہ لگانا چاہتے ہیں کہ کوئی ان کا رقیب تو موجود نہیں ہے۔

(4) محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

تشریح: دیا گیا شعر مرزا غالبؔ کی غزل کا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت میں ایک ایسا وقت اور ایک ایسا موڑ بھی آجاتا ہے جہاں جینے اور مرنے میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ شاعر کی کیفیت بھی کچھ اس طرح ہوگئی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو دیکھ کر ہی زندہ ہے جس کی بے رُخی و بے وفائی کی وجہ سے ہی اس کی زندگی بے لذت و بے سکون ہوگئی ہے اور اسے اپنے جینے اور مرنے میں کوئی فرق نہیں دکھائی دے رہا۔

(5) کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

تشریح: یہ شعر غالبؔ کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ شراب خانہ ایک خراب

جگہ ہے اور شراب پینا مسلمانوں کیلئے حرام ہے۔ لیکن گناہ گار لوگ شراب خانہ جاتے ہیں لیکن واعظ جو نیک ہوتا ہے نصیحت کی باتیں کرتا ہے۔ لوگوں کو بُرائی سے بچنے اور نیک عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ بھلا وہ کیسے شراب خانہ جیسی بُری جگہ جاسکتا ہے اور شراب خانے کا واعظ سے کیا تعلق۔ اُس کی جگہ تو مسجدیں ہیں۔ لیکن شاعر تعجب سے کہہ رہا ہے کہ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ کل میں شراب خانہ سے نکل رہا تھا کہ واعظ شراب خانہ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔



6

غزل

فراقؔ گورکھپوری

- سوالات

سوال(1) ذیل کے اشعار کی تشریح کیجیے۔

(1) بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

تشریح: یہ شعر فراقؔ گورکھپوری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر کہتا ہے اُس کا محبوب اُس کی زندگی میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ اُس کی زندگی اب اس کی نہیں رہی۔ جب بھی شاعر کا محبوب اپنے قدم زمین پر رکھتا ہے تو شاعر کو اس کے قدموں کی آہٹ اپنے دل پر محسوس ہوتی ہے اور شاعر پہچان لیتا ہے کہ اس کی زندگی یعنی اس کا محبوب اس کے آس کے پاس ہی کہیں موجود ہے۔

(2) طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

تشریح: دیا گیا شعر فراقؔ گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اپنے اس

شعر میں کہتا ہے کہ اس کی زندگی اپنی محبوب کی جدائی کی وجہ سے ویران سی ہوگئی ہے اور راتیں تو اور بھی بھیانک شکل اختیار کر لیتی ہیں اور شاعر کی طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور وہ اپنی زندگی کی اس ویرانی اور طبیعت کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے محبوب کے ساتھ گزرے ہوئے خوشگوار لمحات کو یاد کر لیتا ہے اور یہ حسین یادیں کچھ دیر کیلئے شاعر کی گھبراہٹ کو دور کر دیتی ہیں اور اس کی سنسان راتیں مہکنے لگتی ہیں۔

سوال (2) فراقؔ کی شاعرانہ عظمت پر ایک نوٹ لکھیئے؟

جواب: رگھوپتی سہائے فراقؔ اردو کے ایک ممتاز و مایہ ناز شاعر ہیں۔ انہیں شاعری کا شوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا جو عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔ کالج کی تعلیم کے دوران پروفیسر ناصری سے شعری ذوق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فراقؔ شعر کہنے لگے اور فراقؔ تخلص اختیار کیا اور پروفیسر ناصری سے ہی اپنے کلام پر اصلاح لی۔ بعد میں وسیمؔ خیرآبادی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

فراقؔ نے غزل، نظم، رباعی سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی رباعیاں بے حد دلکش اور بہت مقبول ہیں۔ فراقؔ کی غزل نے اردو غزل کو بہت متاثر کیا۔ فراقؔ ایک اچھوتے اور منفرد لہجے کے غزل گو شاعر ہیں۔ فراقؔ کے کلام میں مصحفیؔ کے لہجے کی گھلاوٹ اور عشق کی نرم نرم کیفیتیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ فراقؔ نے میرؔ، ذوقؔ، داغؔ اور ناسخؔ کا اثر بھی قبول کیا۔

فراقؔ نے کالی داس، ٹیگور، سورداس، بہاری، کبیرؔ، شبلیؔ، کیٹسؔ اور ورڈزورتھ سے بھی فیض اٹھایا لیکن اُن کی اپنی آواز ہے جو دور سے پہچانی جاتی ہے جس کیلئے فراقؔ نے برسوں محنت کی۔

فراقؔ کی شاعری کا لب ولہجہ، سکون، نرمی اور ٹھنڈک سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔ وہ اچھوتے تجربات کیلئے لہلہاہٹیں، ملگجاہٹیں جیسے الفاظ وضع کرتے ہیں۔ضرورت کے مطابق کبھی کبھی وہ میرؔ کی زبان (گزاریاں، داریاں، جاگوہو، بھاگوہو) بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندو دیومالا سے انہوں نے اپنی غزل کو ایک خاص دلکشی بخشی ہے۔اس کے لئے وہ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ بھی بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔

اُن کی غزلوں میں اکثر کیفیات کا تذبذب، مجبوری، حیات کے اظہار پر تاسف، غم آمیز پہلو کی ترجمانی قابل دید ہے۔ جذبات نگاری میں فکر کا عنصر شامل کر کے، فراقؔ نہ صرف تاثیر کلام میں اضافہ کر دیتے ہیں بلکہ معنویت بھی بھر دیتے ہیں۔

غرض فراقؔ نے انگریزی شاعری کے بعض اچھوتے انداز اور رویے اردو شاعری کو دیئے جس سے اُن کی شاعری میں اور نکھار پیدا ہو گیا ہے۔

سوال(3) فراقؔ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھیے؟

جواب : فراقؔ کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا فراقؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی

پیدائش 1896ء میں گورکھپور میں ہوئی۔ والد کا نام منشی گورکھ پرشاد تھا وکالت کے علاوہ شاعری بھی کرتے تھے۔ عبرت تخلص تھا۔فراق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ سات سال کی عمر میں جدید تعلیم حاصل کرنے کیلئے اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ فراق بچپن ہی سے ذہین اور محنتی تھے۔ اعلیٰ تعلیم کیلئے الہ آباد کے میور سنٹرل کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں ان کی ملاقات فارسی اورعربی کے پروفیسر ناصری سے ہوئی۔ ناصری کو شعروشاعری کا شوق تھا انہوں نے کالج میں مشاعروں کو رواج دیا۔فراق کو شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور وہ شعر کہنے لگے۔ فراق تخلص اختیار کر کے پروفیسر ناصری سے ہی کلام پر اصلاح لینے لگے۔ بعد میں وسیم خیرآبادی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

بی۔اے کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ کے لئے حکومت نے فراق کا انتخاب کیا لیکن وہ ملازمت قبول کرنے کی بجائے تحریک آزادی میں شریک ہوگئے۔جس کے لئے انہیں جیل بھی جانا پڑا۔جیل سے رہائی کے بعد کرسچین کالج لکھنؤ میں لکچرر ہوگئے۔ کچھ عرصہ سناتن دھرم کالج کانپور میں اردو پڑھائی۔ انگریزی میں بھی ایم۔اے کرلیا اور الہٰ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہوگئے۔

فراق اردو کے تاثراتی نقاد بھی ہیں اوران کے تنقیدی مضامین اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔فراق نے اپنی غزل کے ذریعہ اردو غزل کو بہت متاثر کیا۔ اس کے علاوہ نظم اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ رباعیات بہت مقبول ہیں۔فراق کی شاعری کا لب ولہجہ ’’ سکون، نرمی اور ٹھنڈک سے صاف

پہچان لیا جاتا ہے۔فراقؔ کو بڑے بڑے اعزازات سے نوازا گیا۔انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔اُن کا انتقال 1986ء میں ہوا۔ان کے شعری مجموعے روحِ کائنات، مشعل، روپ، شبستان، اور نغمۂ گل، اردو شعروادب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

- اشعار کی تشریح

(1) بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

تشریح: یہ شعر فراقؔ گورکھپوری کی غزل کا مطلع ہے۔شاعر کہتا ہے اُس کا محبوب اُس کی زندگی میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ اُس کی زندگی اب اس کی نہیں رہی۔ جب بھی شاعر کا محبوب اپنے قدم زمین پر رکھتا ہے تو شاعر کو اس کے قدموں کی آہٹ اپنے دل پر محسوس ہوتی ہے اور شاعر پہچان لیتا ہے کہ اس کی زندگی یعنی اس کا محبوب اس کے آس کے پاس ہی کہیں موجود ہے۔

(2) طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

تشریح: دیا گیا شعر فراقؔ گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔شاعر اپنے اس شعر میں کہتا ہے کہ اس کی زندگی اپنی محبوب کی جدائی کی وجہ سے ویران سی ہوگئی ہے اور

راتیں تو اور بھی بھیانک شکل اختیار کر لیتی ہیں اور شاعر کی طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور وہ اپنی زندگی کی اس ویرانی اور طبیعت کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے محبوب کے ساتھ گزرے ہوئے خوشگوار لمحات کو یاد کر لیتا ہے اور یہ حسین یادیں کچھ دیر کیلئے شاعر کی گھبراہٹ کو دور کر دیتی ہیں اور اس کی سنسان راتیں مہکنے لگتی ہیں۔

(3) خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

تشریح: دیا گیا شعر فراقؔ گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق میں یک طرفہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے اس میں معشوق کی رضامندی بھی ضروری ہے لیکن شاعر نے اپنے دل میں ٹھان لیا ہے یا یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے عشق کا اظہار محبوب کے سامنے کر دے گا چاہے محبوب اس فیصلہ پر رضامند ہو یا نہ ہو۔

(4) تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبار الفت میں
ہم اپنے سر تیرا اے دوست ہر احسان لیتے ہیں

تشریح: دیا گیا شعر فراقؔ گورکھپوری کی غزل سے منتخب کیا گیا ہے۔ شاعر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے دوست ہمارے درمیان اُلفت یا محبت کا جو رشتہ ہے وہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہے اور اس اُلفت میں جو احسان تو نے مجھ پر کیئے ہیں وہ سر آنکھوں پر اور جب بھی موقع ملے میں تیرے یہ احسان زیادہ اچھے

انداز میں چکادوں گا اور میں نہیں چاہتا کہ اس محبت کے لین دین میں تیرا کوئی گھاٹا ہو اور میں دوست کو نقصان اُٹھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

(5) فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

تشریح: فراقؔ گورکھپوری کی غزل کا یہ مقطع ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اُن کا محبوب اکثر بھیس بدل بدل کر اُن سے ملتا ہے تاکہ شاعر کے عشق کو پرکھا جائے کہ وہ اُس سے سچی محبت کرتا ہے یا نہیں۔لیکن شاعر کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اس کا محبوب ہے اور اسے آزمانا چاہتا ہے تو شاعر بھی پہچان لینے کے باوجود اپنے محبوب سے انجانہ برتاؤ کرتا ہے اور اس پر اپنے بے قرار دل کا حال ظاہر ہونے نہیں دیتا۔



1 حصۂ نثر

باغ امید کے دو دروازے

محمد حسین آزاد

I. مختصر سوالات کے جوابات ایک یا دو جملوں میں لکھیے۔

سوال (1) محمد حسین آزاد کی پیدائش کہاں ہوئی؟

جواب: محمد حسین آزاد کی پیدائش 10 / جون 1830ء کو بروز جمعرات دہلی میں ہوئی۔

سوال (2) محمد حسین آزاد کی اہم تصنیف کا نام لکھیئے؟

جواب: محمد حسین آزاد کی اہم تصنیف ''آب حیات'' ہے۔

سوال (3) باغ اُمید کے دو دروازے محمد حسین آزاد کی کونسی کتاب سے لیا گیا ہے؟

جواب: ''باغ امید کے دو دروازے'' محمد حسین آزاد کی کتاب ''نیرنگ خیال'' سے لیا گیا ہے۔

II. طویل سوالات کے جوابات لکھیئے۔

سوال(1) محمد حسین آزاؔد پر نوٹ لکھیئے؟

جواب: محمد حسین آزاؔد کی پیدائش 10 / جون1830ء کودہلی میں ہوئی۔ آزاؔد ابھی بالکل چھوٹے ہی تھے اس وقت ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والدمولوی محمد باقر اور بہن نے مل کر آزاؔد کی پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوکر 1847ء میں دہلی کالج میں داخلہ لیاجواس دورمیں جدیدخیالات ،نئے تصورات اورعلوم وفنون کا مرکز بناہوا تھا۔ آزاؔد نے اپنی قابلیت اورذہانت کی وجہ سے کالج میں قدرکی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔جب شاعری کاشوق ہواتو اپنے والد کے دوست اس وقت کے ممتازشاعرشیخ ابراہیم ذوؔق کواپنا استاد بنایا۔مختلف جگہوں پرملازمت کی۔

آزاؔد ایک تحقیق پسند،لطیف، نفاست طلب اور ستھرے ذوق کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ دہلی کی محفلوں ، دہلی کالج کی صحبتوں اورعلمی ماحول نے ان کے اس ذوق کوخوب چمکایا۔ فارسی زبان پربھی عبورحاصل تھا۔جس کی وجہ سے لاہور کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے وہاں ان کی علمی قابلیت کی خوب قدرہوئی۔ انجمنِ پنجاب لاہورکے سکریٹری کی حیثیت سے نئے طرز کے مشاعروں کی بنیادرکھی اورجدیدنظم کوفروغ دینے میں اہم کرداراداکیا۔

محمد حسین آزاؔد کی سب سے اہم تصنیف ''آب حیات'' ہے۔اس کے علاوہ دربارِاکبری ،سخندانِ فارسی اور نیرنگ خیال بھی اہم تصانیف ہیں۔''آب حیات''

اردو شاعروں اور اردو شاعری کے ارتقاء کا پہلا تذکرہ ہے۔ ''آب حیات'' سے پہلے شعرائے اردو کے تذکرے لکھے گئے تھے لیکن وہ نامکمل تھے۔ اس کمی کو آزاد نے ''آب حیات'' کے ذریعہ پورا کردیا۔ جوان بیٹی کی موت نے آزاد پر جنونی کیفیت طاری کردی تھی اور اسی حالت میں آزاد نے 1910ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ آزاد نے انگریز حکومت سے شمس العلماء کا خطاب بھی پایا۔ مولانا آزاد سادہ اور دلکش زبان استعمال کرتے تھے۔ مولانا آزاد کی اصل حیثیت نثر نگار کی ہے لیکن ان کی شاعری بھی قابل توجہ ہے۔

سوال(2) ''باغ امید کے دو دروازے'' کا خلاصہ لکھیئے۔

جواب: **خلاصہ** : مضمون ''باغِ امید کے دو دروازے'' محمد حسین آزاد کا تحریر کردہ ہے۔ ان کا یہ مضمون، اُن کی کتاب ''نیرنگ خیال'' سے لیا گیا ہے۔ اپنے اس مضمون میں مصنف نے اُمید، کی مختلف کیفیات کو بیان کیا ہے اور ''باغِ اُمید'' میں داخل ہونے کے دو راستے قرار دیئے ہیں۔ یعنی انسان اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اُمید کے سہارے گزار دیتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی عقل و دانش کو استعمال کرتے ہوئے اپنی اُمیدیں پوری ہونے کی توقع رکھتے ہیں لیکن عقل کے ذریعہ اپنے مقصد کو پالینے کیلئے آدمی کو مختلف کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ ابتداء میں ہی ہمت ہار جاتے ہیں۔ بعض ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کا کچھ فاصلہ طے کرلیتے ہیں لیکن پھر مایوس ہوکر اُمید کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی

ہوتے ہیں جو کٹھن مرحلوں کو آزمائشوں کو شکست دے کر ملکہ اُمید کے تخت تک پہنچ بھی جاتے ہیں یعنی اپنے مشن کو پورا کر لیتے ہیں لیکن وہ بھی ملنے والے صلے کو دیکھ کر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ صلہ اُن کی کڑی محنت کے حساب سے بہت کم ہے۔ اُن کی اُمید اور حوصلہ ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ عقلمندی اسی میں سمجھتے ہیں کہ اُمید کی توقع رکھنے کی بجائے قناعت سے یعنی جو کچھ ہے اُسی میں خوش رہنا چاہیئے۔ بہت زیادہ اُمید پر زندگی گزارنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

برخلاف اس کے بہت سے لوگ خیالوں کے ذریعہ بہت زیادہ اُمیدیں لگائے ہوتے ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ اُن کی اُمیدیں ضرور پوری ہوں گی اور ہر ایک کو یہ لگتا ہے کہ اُس کی اُمید پوری ہوگی۔ حالانکہ بغیر کوشش اور جدوجہد کے کامیابی یا کوئی بھی چیز حاصل ہو جانے کی اُمید لگائے بیٹھنا نادانی ہے۔ لیکن وہ خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں اور جو لوگ جدوجہد کرتے ہیں اُن پر ہنستے ہیں اور خود اُمید کے سہارے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے زندگی گزار دیتے ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ میں بھی انہی بے پرواہ لوگوں میں شامل تھا۔ جو کچھ کئے بغیر ہی بہت کچھ حاصل ہو جانے کی اُمید میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزار دیتے ہیں اور جب اپنی پچھلی بے کار گزر جانے والی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُمید میں عمر گزر جاتی ہے اور افلاس رہ جاتا ہے۔ تب آدمی کو ہوش آتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ ہائے یہ میں نے کیا کر دیا جھوٹی امید پر اپنی عمر گنوا دی اور افلاس میں پڑ گیا۔

غرض محمد حسین آزاد بنا جدو جہد کیئے بغیر صرف اُمید کے سہارے زندگی گزارنے والوں کو غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں اور عقل کے ذریعہ بہت زیادہ اُمیدیں باندھنے والوں کو بھی خبردار کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قناعت کا راستہ ہی سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی لیئے آدمی کو چاہیے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہے یا جو کچھ مل جائے اُسی پر شکر گزار بن جائے۔ کیونکہ اُمید نظروں کا دھوکہ ہے فریب ہے۔ کوئی شخص بھی اُمید کے سہارے زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ آدمی کو جدو جہد اور کوشش کرنی چاہیے اور جو کچھ اُس کا صلہ مل جائے اُسی پر اکتفا کر لینا چاہیے۔

III. خالی جگہوں کو صحیح جوابات سے پُر کیجیے۔

(1) محمد حسین آزاد کا انتقال 1910ء سنہ میں ہوا۔

(2) دربارِ اکبری محمد حسین آزاد کی تصنیف ہے۔

(3) سخندانِ فارسی محمد حسین آزاد کی تصنیف ہے۔

IV. متن کے حوالے سے عبارت کی تشریح کیجیے۔

1. ''مگر اس راہ کی زمین پھسلتی، سڑک پتھریلی، راستے ایسے اینچ پیچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اسی کو کہتے ہیں۔''

تشریح: دی گئی عبارت محمد حسین آزاد کے مضمون ''باغِ اُمید کے دو دروازے'' سے لی گئی ہے۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں کہ ''اُمید'' ایک ایسا جذبہ ہے ایک

ایسی شئے ہے جس کا ہر انسان دیوانہ ہے۔اُمید کے سہارے ہی مشکل سے مشکل کام انجام دینے کی کوشش کرتا ہے اور امید پوری ہونے تک آدمی کو کئی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کئی مشکلوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ آزاد کہتے ہیں کہ اُمید کی راہ کی زمین پھسلتی، سڑک پتھریلی، راستے ایسے اینچ پیچ کے ہوتے ہیں کہ اس پر چلنا آسان نہیں ہوتا۔

(2) ''وہ ان کا ہاتھ پکڑتی تھی۔ اس کی رہنمائی سے وہ لوگ گوشۂ قناعت میں جا بیٹھتے تھے۔''

تشریح : یہ عبارت مضمون ''باغِ امید کے دو دروازے'' سے لی گئی ہے جیسے محمد حسین آزاؔد نے تحریر کیا ہے۔ محمد حسین آزاؔد کہتے ہیں کہ کچھ لوگ مستقل مزاج ہوتے ہیں اور کامیابی کی راہ میں آنے والی ہر مشکل کا سامنا کرتے ہیں اور وہ اپنی منزل تک پہنچ بھی جاتے ہیں لیکن اُن کی کڑی محنت و مشقت کا صلہ اُن کی امید سے بہت کم ملتا ہے اور وہ پچھتاتے ہیں اور اُن کا خیال ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ حق تلفی ہوئی ہے۔ اور اس حق تلفی سے دل برداشتہ ہو کر قناعت پسند ہو جاتے ہیں۔ جو مل جاتا ہے اُسی پر شاکر ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ کی امید نہیں کرتے۔



2

مرزا غالبؔ کے اخلاق و عادات وخیالات

مولانا الطاف حسین حالیؔ

I. متن کے حوالے سے جملوں کی تشریح کیجیے۔

(1) ''اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے چھین کر پہن لوں۔''

تشریح: دیئے گئے جملے الطاف حسین حالیؔ کے لکھے مضمون ''مرزا غالبؔ کے اخلاق و عادات وخیالات'' سے لئے گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ اپنے اُن دوستوں سے جو حالات کا شکار ہوکر مجبور زندگی گزار رہے تھے نہایت شریفانہ انداز سے اُن کی مدد کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک دوست غدر کے بعد غربت کا شکار ہو گئے تھے ایک دن مرزا غالبؔ سے ملنے کیلئے آئے اور اُن کے جسم پر نہایت معمولی کپڑے کا فرغل تھا یہ دیکھ کر مرزا غالبؔ کو بہت دکھ ہوا کہ جو آدمی ہمیشہ مالیدہ یا جامہ دار چغوں میں ملبوس رہا کرتا تھا آج چھینٹ کا معمولی فرغل پہنا ہوا ہے۔ مرزا غالبؔ نے اس چھینٹ کی

تعریف کی اور بڑے ہی خوبصورت طریقہ سے اُن کا چھینٹ کا فرغل لے کر اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُس دوست کو پہنا دیا۔ اس طرح مرزا غالبؔ نے اپنے دوست کے ساتھ سلوک کیا۔

(2) ''ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔''

تشریح : اوپر دی گئی عبارت ''مرزا غالبؔ کے اخلاق و عادات وخیالات'' سے لی گئی ہے جسے مولانا الطاف حسین حالیؔ نے لکھا ہے۔ حالیؔ کہتے ہیں کہ مرزا غالبؔ کی گفتگو بھی اُن کی تحریر اور اُن کی نظم و نثر ہی کی طرح پر لطف ہوتی تھی اُسی لئے لوگ اُن سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے خواہش مند رہتے تھے۔ وہ کم بولتے تھے لیکن جو کچھ کہتے وہ لطف سے بھرپور ہوتا۔ مزاج میں ظرافت اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔

(3) ''اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔''

تشریح : دی گئی عبارت الطاف حسین حالیؔ کے تحریر کردہ مضمون ''مرزا غالبؔ کے اخلاق و عادات وخیالات'' سے لی گئی ہے۔ مرزا غالبؔ موسم گرما میں اپنے مکان کے چھت پر بنے ہوئے تنگ و تاریک کوٹھری میں بیٹھا کرتے۔ ایک دن رمضان کے مہینے میں جب گرمی اپنے شباب پر تھی دوپہر کے وقت مولانا آزردہ، غالبؔ سے

ملنے آئے اس وقت مرزا اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ بیٹھے چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ آزردہ نے کہا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے ایسا حدیث میں آیا ہے۔ مرزا غالب نے کہا کہ حدیث بالکل صحیح ہے لیکن جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔

II. مختصر سوالات کے جوابات دیجئے۔

سوال (1) حالی کی ولادت کہاں ہوئی؟

جواب: الطاف حسین حالی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔

سوال (2) حالی کی وفات کب ہوئی؟

جواب: حالی کی وفات 1914ء میں ہوئی۔

سوال (3) مسدس مدوجزر اسلام کس نے لکھا؟

جواب: مسدس مدوجزر اسلام الطالف حسین حالی نے لکھا۔

III. طویل سوالات:

سوال (1) حالی کی زندگی پر نوٹ لکھیئے۔

جواب: حالی جن کا اصل نام الطاف حسین تھا 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم پانی پت ہی میں حاصل کی۔ عربی اور فارسی کی مزید تعلیم حاصل کرنے

کیلئے دہلی آ گئے۔ مرزا غالبؔ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے فیض حاصل کیا۔ شیفتہؔ کے انتقال کے بعد مولانا حالیؔ لاہور چلے گئے اور پنجاب بکڈپو میں ملازمت اختیار کرلی۔ مولانا محمد حسین آزادؔ کے شروع کردہ نئے انداز کے مشاعروں میں حالیؔ نے عمدہ نظمیں پڑھیں۔ چار سال کے بعد وہ پھر دہلی لوٹ آئے اور ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی اور ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ سرسید کی فرمائش پر انہوں نے ایک نظم ''مدّ و جزر اسلام'' لکھی۔ جسے سرسید اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

مولانا حالیؔ تنقید نگار اور سوانح نگار بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن بہت جلد با مقصد شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حالیؔ کی شاعری پر غالبؔ سے زیادہ شیفتہؔ اور سرسید کا اثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ حالیؔ کی نظموں میں سادگی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ غزل اور نظم دونوں پر حالیؔ نے گہرا نقش چھوڑا ہے۔ حالیؔ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی رہنمائی کی۔ غزل اور قصیدہ کی خامیوں کو اُجاگر کیا۔ اور ساتھ ہی مرثیہ ومثنوی کی اہمیت کو واضح کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ شاعری میں سادگی، جوش اور اصلیت ہونی چاہیے۔ مقدمہ شعروشاعری لکھ کر اردو میں باضابطہ تنقید کا آغاز کیا۔ اُن کی اس کتاب کو پروفیسر آل احمد سرورؔ نے اردو شاعری کا پہلا مینی فیسٹو قرار دیا۔ حالیؔ بیک وقت نثر اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ شاعر، مضمون نگار، سوانح نگار اور نقاد بھی تھے۔ نثر میں مقدمہ شعروشاعری، حیات سعدی، حیات جاوید، یادگارِ غالبؔ

اورمقالات حالؔی، ان کی مشہور کتابیں ہیں۔منثویوں میں ''حب وطن ، مناجات بیوہ اور چپ کی داد'' وغیرہ شہرت کی حامل ہیں۔ حالؔی کا انتقال 1914ء میں ہوا۔

سوال(2) مرزا غالبؔ کے عادات خیالات پر تفصیلی روشنی ڈالیئے؟

جواب: مولانا الطاف حسین حالؔی اپنے مضمون میں مرزا غالبؔ کے اخلاق، عادات وخیالات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مرزا غالبؔ نہ صرف ایک اعلیٰ خاندانی آدمی تھے بلکہ بہت اچھے اخلاق کے مالک تھے وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو بھی ایک باران سے ملتاوہ بار بار ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔ دوستوں کودیکھ کراوراُن سے مل کروہ بے انتہا خوش ہوجاتے اوراُن کے غم میں بھی برابر کے شریک رہتے۔ اُن کے دوستوں اورچاہنے والوں میں ہر مذہب وملت کے لوگ پورے ہندوستان میں موجود تھے۔غزلوں کی اصلاح اورمختلف قسم کی فرمائشوں کوبھی دوستوں کے اصرار پر پورا کیا کرتے تھے۔

مروت اورلحاظ اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کربھرا تھا۔ مرزا غالبؔ کی آمدنی اگرچیکہ قلیل تھی لیکن بڑے فراخ دل تھے۔ وہ ہر ایک کی مدد کیا کرتے کوئی اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہروقت ان کے مکان کے سامنے اندھے، لولے،لنگڑے پڑے رہتے۔غریبوں کی مدد کی وجہ سے اکثر خود قرض میں مبتلا ہوجاتے۔حالات کے ہاتھوں پریشان دوستوں کے ساتھ اس انداز سے سلوک کرتے کہ انہیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ غالبؔ نے ان کی مدد کی ہے۔

مرزا غالبؔ بہت ذہین اور جدت طرز تھے۔ جو بھی کتاب ایک بار پڑھ لیتے اس کے اہم نکات اُن کے ذہن میں محفوظ ہو جاتے۔ فارسی زبان کے ایسے الفاظ و محاورات اپنے کلام میں استعمال کرتے جس کی سند دی جا سکتی تھی۔ اپنے کلام پر اعتراض کرنے والوں کو اساتذہ کے مستند ثبوت کے ساتھ قائل کر دیتے تھے۔

مرزا غالبؔ کے مزاج میں ظرافت بھری ہوئی تھی اس لئے حالیؔ، مرزا غالبؔ کو حیوان ناطق کی بجائے حیوان ظریف کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مرزا غالبؔ اور اُن کے دوستوں کے تعلق سے کئی مشہور لطائف موجود ہیں۔ جس سے غالبؔ کی ظرافت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُن کی خوبی تھی۔ جہاں تک غذا کا تعلق ہے حالیؔ لکھتے ہیں کہ مرزا غالبؔ کی مرغوب غذا گوشت تھی۔ ان کے ہر کھانے کے ساتھ گوشت موجود ہوتا لیکن بیماری کے آخری دنوں میں خوراک نہایت کم ہوگئی تھی۔ ناشتہ میں بادام کا شیرہ، دوپہر کو پاؤ سیر گوشت کا شوربا اور ایک روٹی ہوا کرتی۔ کبھی کبھی انڈے کی زردی اور کچھ دہی ان کا معمول تھا۔ شام کو شامی کباب یا سیخ کے کباب کھایا کرتے تھے۔

حالیؔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا، برتن تو بہت تھے، مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کے مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔''

مرزا غالبؔ کا پسندیدہ میوہ آم تھے اور اُن کی اس مرغوبیت کو دیکھتے ہوئے، اکثر دوست انہیں آم کا تحفہ بھجوایا کرتے تھے۔ آم کے بارے میں مرزا کی رائے یہ تھی کہ میٹھا ہو اور بہت ہو۔

مرزا شراب کے بھی عادی تھے اور رات کو سوتے وقت تھوڑی شراب میں گلاب کا عرق ملا لیا کرتے۔

غرض مرزا غالبؔ کے اخلاق اعلیٰ، عادات پابند نظم وضبط اور خیالات نیک و پاکیزہ تھے۔ دوستوں، چاہنے والوں، غریبوں، مستحق لوگوں سے ان کا سلوک اُن کے مرتبہ ومقام کے لحاظ سے ہوا کرتا۔ کھانے پینے میں اعتدال پسند تھے۔ مرزا غالبؔ نہ صرف ایک بلند پایا شاعر تھے بلکہ اعلیٰ اخلاق واطوار اور بہت سی خوبیوں کے مالک ایک اچھے انسان بھی تھے۔

- **خالی جگہوں کو صحیح لفظوں سے پُر کیجیے۔**

(1) ''خاندان تیموریہ'' کی تاریخ فارسی زبان میں مرزا غالبؔ نے لکھی۔

(2) ابراہیم ذوقؔ کی وفات پر بہادر شاہ ظفرؔ غالبؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔

(3) غالبؔ کی وفات 1869ء سنہ میں ہوئی۔



3

اَرہر کا کھیت

رشید احمد صدیقی

I. مندرجہ ذیل کی بحوالہ متن تشریح کیجیے۔

(1) ''دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔''

تشریح: مندرجہ بالات عبارت رشید احمد صدیقی کے انشائیہ ''اَرہر کا کھیت'' سے لی گئی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ گاؤں والوں کے لئے اَرہر کا کھیت پارلیمنٹ کا کام کرتا ہے۔ جہاں بیٹھ کر گاؤں کے تمام مسئلوں کو حل کیا جاتا ہے فیصلے کیئے جاتے ہیں۔ جس طرح ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین کا انتظامی معاملات میں دخل ہوتا ہے اتنا ہی دخل گاؤں کی خواتین اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں ہوتا ہے۔ جہاں دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ یعنی اپنے کو مظلوم ثابت کرنا۔ بحث کرنا۔ سزا پر رونا، الزامات پر لڑنا یہی کچھ اَرہر کے کھیت میں جمع ہونے پر ہوتا ہے۔

(2) ناظرین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ لشکرکس مہم پر روانہ ہوا تھا؟

تشریح : دی گئی عبارت انشائیہ ''اَرہر کا کھیت'' سے لی گئی ہے۔ جسے رشید احمد صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جوانی کھونے کے ہندوستان میں دو بڑے جانے پہچانے مقام تھے۔ شہر کی گلیاں اور ''اَرہر کے کھیت''۔ اَرہر کے کھیت'' دیہاتیوں کیلئے اسمبلی کی حیثیت رکھتے تھے۔ جہاں عوام کے اچھے بُرے کے فیصلے ہوا کرتے ہیں۔ آج پھر گاؤں میں بوڑھے، عورتیں، نوجوان لڑکے لڑکیاں اور بچے جمع ہوکر قافلہ کی شکل میں اَرہر کے کھیت کی طرف رواں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گاؤں میں پھر کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی کسی کی جوانی کھوگئی ہے۔اسی کا فیصلہ کرنے کے لئے شاید گاؤں کے لوگ اَرہر کے کھیت میں جمع ہوئے ہیں۔ اور مصنف کو یقین ہے کہ ناظرین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ لشکرکس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ اور آج کون سزا بھگتے گا۔کون دیہاتیوں کے ہاتھوں مار کھائے گا۔

(3) ''فلاں کی شادی کب اور کہاں ہورہی ہے؟ داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے۔''؟

تشریح : یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے انشائیے ''اَرہر کا کھت'' سے لی گئی ہے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ ''اَرہر کے کھیت'' کی دیہاتوں میں بہت اہمیت ہوتی ہے۔ یہ عورتوں کی پارلیمنٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں ہر قسم کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے فیصلے اَرہر کے کھیت ہی میں کیئے جاتے ہیں۔ سزائیں بھی

یہیں دی جاتی ہیں۔ بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ اختلافات بھی پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھی بھگڈر مچ جاتی ہے اور جمع لوگ بھاگنے لگتے ہیں۔ اَرہر کے کھیت میں اس بات پر بھی بحث ہوتی ہے کہ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے؟ یا یہ کہ داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے؟ یعنی کسی معاملے کو رفع دفع کرنے یا کسی ایک کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے رشوت لینے پر بھی بحث ہوتی ہے۔

(4) ''حاجی صاحب قبلہ نے گھبرا کر بے اختیار ہو کر فرمایا: ارے میاں یہ سب تو ہوا، اب کیا ہوا''؟

تشریح : دی گئی عبارت انشائیہ ''اَرہر کا کھیت'' سے لی گئی ہے۔ انشائیہ نگار کا نام رشید احمد صدیقی ہے۔ رشید احمد کہتے ہیں کہ وہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے کلاس میں پہنچ گئے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ ان کی کلاس کی طرف کا دروازہ کھل جانے کی وجہ سے مختلف لوگ اسے راستے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ پہلے تو ایک کتا آیا۔ پھر ایک بہشتی اور خوانچہ والا سامنے سے گزر گیا۔ پھر ایک حاجی جن کا نام بلغ العلا تھا تیزی سے وہاں آئے جن کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی آتے ہی جلدی سنانے کی فرمائش کی۔ رشید احمد صدیقی نے ایک شعر سنایا۔ موضوع بتانے کو کہا تو حاجی صاحب نے ''اَرہر کا کھیت'' پر مضمون لکھنے کا مشورہ دیا۔ رشید احمد صدیقی نے نواب مزمل اللہ خاں صاحب کو شعر سنانے کیلئے کہا تو حاجی صاحب نے کہا وائس چانسلر صاحب کو۔ رشید احمد نے کہا کہ اگر مسعود یار جنگ بہادر کو سنانا ہے تو

پھر یہ سنائیے گا۔ پھر انہوں نے فارسی میں شعر کہا۔ حاجی صاحب، رشید احمد صدیقی کی باتوں سے کچھ اُکتا گئے اور فرمایا ارے میاں یہ سب تو ہوا، اب کیا ہوا؟ میں تو کلاس میں بیٹھ کر تمہارا لکچر سنوں گا۔ غرض اسی قسم کی بے مقصد گفتگو پر حاجی صاحب سے ملاقات ختم ہوگئی۔

II. مختصر سوالات کے جوابات تحریر کیجیے۔

سوال (1) اَرہر کے کھیت میں کیا کیا پیش آتے ہیں؟

جواب: دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور معاشرتی حوادث اَرہر کے کھیت ہی میں پیش آتے ہیں۔

سوال (2) گاؤں کا دھواں پھیلنے لگتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

جواب: گاؤں کا دھواں پھیلنے لگتا ہے تو کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں۔ اور ذہنوں میں ایک ہی بات ہوتی ہے کہ گھر پہنچنے پر کھانا ملے گا، عافیت ملے گی اور سونے کو ملے گا۔

سوال (3) اَرہر کے کھیت میں کن کن واقعات پر بحث ہوتی ہے؟

جواب: اَرہر کے کھیت میں ان واقعات پر بحث ہوتی ہے کہ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے؟ داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے؟ پٹواری کی

بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکمنیا کے بچے کیوں نہیں پیدا ہوئے وغیرہ۔

سوال (4) کھیت کے چاروں طرف سے کون کون نکلنے لگے؟

جواب: کھیت کے چاروں طرف سے مرد عورت بچے، گیڈر، کتے، لومڑی، بن بلاؤ، نکلنے لگتے۔

III. طویل سوالات کے جوابات:

سوال (1) اَرہر کے کھیت کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیئے۔

جواب: ''اَرہر کا کھیت'' مضمون رشید احمد صدیقی کا لکھا ہوا ہے۔ مصنف کہنا ہے کہ لندن میں ہائیڈ پارک کو جو اہمیت حاصل ہے دیہات میں اَرُہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے۔ اَرُہر کے کھیت میں دیہات اور دیہاتیوں کے ذمہ دار اپنے فرائض یہیں انجام دیتے ہیں۔ فطری ضروریات یہیں پوری کی جاتی ہیں۔ معاشرہ میں ہونے والے حادثات یہیں پیش آتے ہیں۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ ہائیڈ پارک لندن میں کی جانے والی بے ہودگیاں آرٹ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن ارہر کے کھیتوں کی بے ہودگیوں کا انجام لڑائی جھگڑے پر ہوتا ہے۔

ارہر کا کھیت گاؤں کی اسمبلی کی حیثیت رکھتا ہے جہاں گاؤں میں ہونے والی ہر سرگرمی کے بارے میں بحث وفیصلہ ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی حادثہ یا واقعہ

دیہات میں رونما ہوتا ہے سب لوگ بچے بوڑھے، لڑکیاں، عورتیں ارہر کے کھیت میں جمع ہوجاتے ہیں۔ اور وہیں ہر بات کا فیصلہ اور انکشاف ہوتا ہے۔

ارہر کا کھیت گاؤں کی اسمبلی کی حیثیت رکھتا ہے جہاں گاؤں میں ہونے والی ہر سرگرمی کے بارے میں بحث وفیصلہ ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی حادثہ یا واقعہ دیہات میں رونما ہوتا ہے سب لوگ بچے بوڑھے، لڑکیاں، عورتیں ارہر کے کھیت میں جمع ہوجاتے ہیں۔ اور وہیں ہر بات کا فیصلہ اور انکشاف ہوتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ جوانی کھونے کے ہندوستان میں دو بڑے جانے پہچانے تھے۔ شہر کی گلیاں اور ارہر کے کھیت لیکن موجودہ دور میں یونی ورسٹیز اور کارخانے بھی شامل ہوگئے ہیں۔ یہاں جو بھٹک جاتا ہے وہ یا تو دواخانہ پہنچ جاتا ہے یا پھر جیل خانہ۔ دیہاتی اور شہری کی سوچ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ کسان یا دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک گاؤں میں زمین دار اور پٹواری موجود ہیں اُس کی ساری ملکیت کبھی بھی منتقل ہوسکتی ہے سوائے عورت کے یعنی بیوی کے۔ برخلاف اس کے شہری سمجھتا ہے کہ جب تک یورپ اور دولت کی حکمرانی ہے اس وقت تک کچھ بھی منتقل یا غیر منقولہ ہے سوائے عورت کے۔ دیہاتی عورت کو عزت کا اصل سرمایہ سمجھتا ہے اور شہری تفریح کا ذریعہ۔ دیہاتی کے نزدیک عورت اُس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے بولتا ہے۔ آرام کرتا ہے۔ سکون اور آسودگی حاصل کرتا ہے۔ لیکن ایک پڑھے لکھے کے نزدیک ایک پڑھے لکھے کے نزدیک عورت ایک وسیلہ ہے جنسی تقاضہ حاصل کرنے کی عیش کرنے و دل بھلائی کیلئے۔

ارہر کے کھیت کو مصنف دیہاتیوں کیلئے زنانہ پارلیمنٹ قرار دیتے ہیں جہاں گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا واقعہ بحث کا موضوع بنتا ہے۔ کبھی کبھی پارلیمنٹ میں جس طرح ہنگامہ برپا ہوجاتا ہے ارہر کے کھیت میں بھی بات بڑھتے بڑھتے لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے اور ہنگامہ شروع ہوجاتا ہے اور کھیت کے چاروں طرف سے بچے بوڑھے، مرد عورت، گیڈر، کتے، لومڑی نکل کر بھاگنے لگتے ہیں جیسے اسمبلی میں بم گرا ہو۔

غرض رشید احمد صدیقی نے دیہات کے ارہر کے کھیت کا تقابل ملک کی اسمبلی یا پارلیمنٹ سے کیا ہے جہاں انکشافات، فیصلے، سزائیں اور تُو تُو مَیں مَیں، بھگڈر مچ جاتی ہے ویسا ہی ارہر کے کھیت میں بھی ہوتا ہے۔ مصنف نے دیہاتی اور شہری کی سوچ کا بھی تقابل کیا ہے۔ غرض ارہر کا کھیت ایک فلسفیانہ انداز کا مضمون ہے جو اپنے اندر بڑی گہری باتیں چھپائے ہوئے ہے۔

سوال (2) رشید احمد صدیقی کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

جواب: رشید احمد صدیقی کی پیدائش 25 / ڈسمبر 1894ء کو ضلع بلیا میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم دینیات، بغدادی قاعدہ، عربی اور فارسی مولوی قدرت اللہ صاحب سے حاصل کی۔ اسکول کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز جون پور سے ہوا۔ 1908ء میں انہیں چوتھی جماعت میں داخلہ دلوایا گیا۔ اسکولی تعلیم کے اختتام پر 1914ء میں انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ رشید احمد صدیقی انگریزی اور اردو میں ابتداء ہی سے اچھے تھے

لیکن ریاضی میں بہت کمزور تھے اور فیل ہو جایا کرتے۔ پڑھنے لکھنے سے زیادہ انہیں کھیل کود میں دلچسپی تھی۔ 1919ء میں انہوں نے بی۔اے کی تکمیل کی اور 1921ء میں ایم۔اے کرنے کے بعد ہائی اسکول میں مدرس ہو گئے اور پھر 1922ء میں انٹر کالج میں اردو مولوی کی خدمات انجام دینے لگے۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں عارضی طور پر لکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1923ء میں جمیلہ خاتون سے ان کی شادی ہو گئی اور 1926ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُن کا مستقل طور پر تقرر عمل میں آیا۔ 1935ء میں ریڈر، 1954ء میں پروفیسر بنے اور 1958ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ حکومت ہند نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا۔ ساہتیہ اکیڈیمی نے ان کی کتاب ''غالبؔ کی شخصیت اور شاعری'' پر ادبی اعزاز عطا کیا۔

رشید احمد صدیقی طنز و مزاح نگار کے ساتھ ساتھ مرقع نگار اور انشاء پرداز بھی تھے۔ ان کی تحریر میں نفاست و شگفتگی پائی جاتی ہے۔ وہ کسی بھی مضمون کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے خوب واقف تھے۔ ان کی زیادہ تر تحریریں انشائیہ نگاری کے زمرہ میں آتی ہیں۔ ''ارہر کا کھیت'' اور ''وکیل'' ان کے بہت مقبول انشائیے ہیں جبکہ ''مغالطہ''، گھاگ اور چارپائی'' کا شمار دلکش انشائیوں میں ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان کا طویل خاکہ ہے۔ اور خاکوں کے مجموعوں کے نام ''گنجہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' ہیں۔ ان کی کتابوں '' آشفتہ بیانی میری'' شیخ نیازی اور ''مضامین رشید'' میں

بھی خاکے موجود ہیں۔''طنزیات ومضحکات'' بھی ان کی اہم کتاب ہے۔

غرض رشید احمد صدیقی اردو کے ممتاز ومعروف طنز ومزاح نگار ہیں۔

IV. خالی جگہوں کو صحیح لفظوں سے پُر کیجیے۔

(1) اُہر کا کھیت رشید احمد صدیقی کا مضمون ہے۔

(2) رشید احمد صدیقی کو پدم شری کا اعزاز 1963ء میں ملا۔

(3) ہائیڈ پارک لندن شہر میں ہے۔



4

اللہ دے بندہ لے

رضیہ سجاد ظہیر

I. مندرجہ ذیل کی بحوالہ متن تشریح کیجیے۔

(1) ”لیکن اس ترقی کے باوجود ایک کمی اس کی شخصیت میں رہ گئی کہ وہ بوٹ (جوتا) نہیں خرید سکا۔“

تشریح : دی گئی عبارت رضیہ سجاد ظہیر کے مضمون ”اللہ دے بندہ لے“ سے لی گئی ہے۔فخرو جو گاؤں کا ایک گنوار آدمی تھا۔مراد آباد پہنچنے تک وہ کافی سمجھدار ہو گیا تھا۔دھوتی کی جگہ تہمد اور تہمد کی جگہ پاجامہ اور قمیص پہننا شروع کر دیا تھا۔اردو پڑھنا لکھنا بھی سیکھ چکا تھا۔بیرسٹر ماموں جو اُسے گاؤں سے اپنے ساتھ لے آئے تھے جو کتاب کہتے فخرو اُسے الماری سے نکال لاتا۔ داستانیں اور رسالوں کی پہچان اسے ہو چکی ہے لیکن اس ترقی کے باوجود ایک کمی اس کی شخصیت میں رہ گئی تھی وہ بوٹ جوتا نہیں خرید سکا تھا کیونکہ پانچ روپۓ تنخواہ میں مختلف اخراجات کے بعد اس کے پاس اتنے پیسے نہیں بچ پاتے کہ وہ بوٹ خرید سکتا۔اس لئے اس کی شخصیت ادھوری رہ گئی تھی۔

(2) ''بیرسٹر ماموں کئی سال ولایت میں رہے تھے،سوٹ پہنتے تھے۔''

تشریح : یہ عبارت ''اللہ دے بندہ لے'' سے لی گئی ہے۔اس کی مصنفہ رضیہ سجاد ظہیر ہیں۔ بیرسٹر ماموں حالانکہ وکالت کرتے تھے کئی سال ولایت میں رہے تھے۔سوٹ پہنتے تھے۔ انگریزی فرّاٹے سے بولتے تھے اس کے باوجود وہ نماز پانچوں وقت پڑھا کرتے۔ بلند آواز میں اذان دیتے تو اُن کی گرج دار آواز سُن کر گھر کے تمام افراد فوراً نماز پڑھنے کھڑے ہوجاتے۔ بیرسٹر ماموں کے والد اپنے بیٹے پر فخر کرتے کہ وہ ولایت میں اتنے دنوں رہنے کے بعد بھی پانچوں وقت نماز پڑھتا ہے اور پورے تیس روزے بھی رکھتا ہے اور کئی عورتوں کو بھی ماموں نے دین وایمان کا راستہ دکھایا انہیں نماز سکھا کر گمراہی سے بچایا۔

(3) ''مغرب کی نماز کے لئے ماموں مسجد جانے لگتے تو فخرو سے بھی کہتے ''ابے چل مسجد''۔

تشریح: اوپری دی گئی عبارت رضیہ سجاد ظہیر کے تحریر کردہ مضمون ''اللہ دے بندہ لے'' سے لی گئی ہے۔ بیرسٹر ماموں صبح اور مغرب کی نماز مسجد میں پڑھا کرتے اور جب وہ مغرب کی نماز کیلئے مسجد جانے لگتے تو فخرو جواُن کا ملازم تھا اُس سے بھی کہتے ''ابے چل مسجد''۔لیکن فخرو نماز پڑھنے سے انکار نہیں کرتا لیکن کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ جیسے گھر کے دفتر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتا اور بڑی معصوم صورت بنا کر کہتا کہ آفس میں ایک موٹا موکل موجود ہے اگر وہ نماز کو جائے گا تو

موکل نکل جائے گا اسی لئے وہ یعنی بیرسٹر ماموں نماز کو جائے تب تک وہ موکل کو باتوں میں اُلجھائے رکھے گا۔

(4) ''اجی واہ خوب کہو ہو'' اللہ کا کرنا تھا، جی وہ تو دیوے ہے اُسے لے کے کیا کرنا ہے۔''

تشریح : یہ عبارت مضمون ''اللہ دے بندہ لے'' سے لی گئی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے اسے تحریر کیا ہے۔ فخرو جو بیرسٹر ماموں کا وفادار ملازم تھا۔ اس کی عین خواہش تھی اور وہ دعائیں بھی کرتا تھا کہ اللہ اسے ایک جوتا بوٹ کا مالک بنا دے۔ کسی طرح اللہ نے اس کی یہ دعا قبول کرلی اور اُسے ایک عمدہ بوٹ تحفہ میں مل گیا۔ بیرسٹر ماموں اُسے بوٹ ملنے کی خوشی میں نماز پڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرنے کا مشورہ دیا اور فخرو اس کا دوست مجبوراً مسجد گئے نماز پڑھی اور وعظ بھی سنا۔ لیکن اس دوران کسی نے فخرو کا نیا بوٹ چرالیا۔ اُس کے بعد سے فخرو کبھی مسجد نہیں گئے اور نہ نماز پڑھی۔ فخرو بوڑھے ہو چکے تھے۔ جب کبھی اُن سے کوئی یہ کہہ دیتا کہ ''اللہ کی مرضی یہی تھی تو وہ بگڑ جاتے اور کہتے ''اجی واہ خوب کہو ہو، اللہ کا کرنا تھا، اجی وہ تو دیوے ہے اُسے لے کے کیا کرنا ہے۔''

II. مختصر سوالات کے جوابات تحریر کیجئے۔

سوال (1) فخرو کہاں سے آیا تھا اور کیا پہنتا تھا؟

جواب: فخرو سرسی سے آیا تھا اور دھوتی و کمری پہنتا تھا۔

سوال(2) بیرسٹر ماموں اذان دیتے تو کیا ہوتا تھا؟

جواب: بیرسٹر ماموں اذان دیتے تو تمام گھر والوں کے ہوش گم ہوجاتے اور اُن کی گرج دار آواز کے دبدبہ میں آکر فوراً نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے۔

سوال(3) فخرو کا جوتا (بوٹ) کیسا تھا؟

جواب: فخرو کا جوتا بہت عمدہ، چمکدار جس میں صورت نظر آجائے۔ چھ چھوٹی چھوٹی آنکھیں یعنی سوراخ جس میں ریشمی ڈوریاں پڑی ہوئیں تھیں۔ آخر میں کالا بٹن جڑا ہوا جس میں سے آخر کی طرف چھوٹا سا فیتہ یعنی ڈوری کا پھندا اس طرح منہ اٹھائے تھا جیسے کوئی محبوب اپنے رسیلے ہونٹوں کو سکوڑ کر سیٹی بجا رہا ہو۔

سوال(4) فخرو کا جوتا گم ہوجانے پر بیرسٹر ماموں نے کیا کہا؟

جواب: فخرو کا جوتا مسجد میں گم ہوجانے پر بیرسٹر ماموں نے فخرو کو دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ ’’چل جانے دے۔ میں تجھے دوسرا لے دوں گا اس سے بھی بہتر۔ اور یہ بھی کہا کہ ’’سمجھ لے جس اللہ نے دیا تھا اُسی نے لے لیا۔‘‘

III. طویل سوالات کے جوابات

سوال(1) افسانہ اللہ دے بندہ لے کا خلاصہ لکھیئے۔

جواب: **خلاصہ**: افسانہ ’’اللہ دے بندہ لے‘‘ رضیہ سجاد ظہیر کا لکھا ہوا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک ایسے جاہل گاؤں والے کی کہانی پیش کی ہے جو

نماز نہیں پڑھتا تھا اور مسجد جانے سے کتراتا تھا لیکن اللہ پر اُس کا ایمان دوسروں سے بہت زیادہ پختہ تھا۔

فخرو جو سری گاؤں سے نکل کر مراد آباد تک پہنچ جاتا ہے جگہ کے ساتھ ساتھ اُس کے لباس اور رہن سہن میں بھی واضح فرق آتا جاتا ہے۔ دھوتی اور کمری کی بجائے وہ کُرتا، قمیص اور پاجامہ پہننے لگتا ہے۔ وہ ولایت میں رہ کر آئے بیرسٹر ماموں جنہیں فخرو میر صاحب کہتا ہے کا وفادار ملازم ہے اور ماموں کی صحبت میں رہ کر اُردو بھی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتا ہے۔ بیرسٹر ماموں اُسے ہر ماہ پانچ روپے تنخواہ دیتے ہیں جو فخرو اپنے گاؤں بھجوانے کے ساتھ دوسرے کاموں میں خرچ کر دیتا ہے۔ لیکن اُس کی ایک دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ ایک عمدہ سا جوتا خریدے لیکن اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی۔ فخرو، جوتے کیلئے اللہ سے دعا کرتا رہتا ہے۔ بیرسٹر ماموں جو نماز کے پابند ہیں اور ہر بار فخرو کو نماز کے لئے مسجد چلنے کیلئے کہتے ہیں لیکن فخرو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مسجد جانے اور نماز پڑھنے سے بچ جاتا ہے۔ وہ رمضان کے روزے پابندی سے رکھتا ہے اور جب ماموں بغیر نمازوں کے روزوں کی اہمیت و قبولیت کو مشکوک کہتے ہیں تو فخرو اُنہیں قائل کروانے کیلئے کہتا ہے کہ میر صاحب آپ نے جو کتاب پڑھائی ہے اُس میں تو روزہ الگ لکھا ہے اور نماز الگ لکھی ہے۔ ماموں چپ ہو جاتے۔ ماموں، فخرو سے مسجد آنے سے انکار کی وجہ پوچھتے تو وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیتا اور کہتا کہ توبہ توبہ کون انکار کرے ہے میں تو کئی مرتبہ مسجد جا چکا ہوں، افطار دینے اور دوسرے کاموں کے لئے۔

اتفاق سے بیرسٹر ماموں کا ایک موکل ایک کیس میں بری ہوجانے کی خوشی میں فخرو کو ایک عمدہ سا جوتا، پالش کی ڈبیا اور بُرش تحفہ میں دیتا ہے۔ جوتا پا کر فخرو کو اپنے اللہ پر یقین بڑھ جاتا ہے کہ اللہ نے اس کی دعا سن لی اور اسے جوتا دلوا دیا۔ گھر کے تمام افراد کے ساتھ ساتھ خود ماموں بھی فخرو کی خواہش پوری ہونے پر خوش ہوتے ہیں اور جوتے کا نام خدا بخش رکھنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ اور فخرو کو اللہ کا شکرادا کرنے کیلئے مسجد چلنے کیلئے کہتے ہیں۔ پھر بھی فخرو انجان بن جاتا ہے۔

اتفاق سے فخرو نئے کپڑے پہنے پان کھائے اور نیا جوتا پہنے اپنے دوست کے ساتھ مسجد کی گلی سے آرہا ہے ہوتا ہے کہ ماموں کی نظر اس پر پڑ جاتی ہے اور وہ اصرار کر کے فخرو اور اس کے دوست کو مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ فخرو پہلی بار مسجد میں نماز پڑھتا ہے اور مولوی صاحب کا وعظ بھی سنتا ہے وعظ ختم ہونے کے بعد جب وہ مسجد سے نکلتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا نیا جوتا چوری ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ماموں بھی سکتہ میں آجاتے ہیں۔ بیرسٹر ماموں، فخرو کو دلاسہ دیتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ وہ افسوس نہ کرے وہ اسے اس سے اچھا جوتا خرید کر دیں گے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ''جس اللہ نے دیا تھا اسی نے لے لیا''۔ ماموں کی اس بات پر فخرو بھڑک جاتا ہے اور کہتا اللہ نے تو دیا تھا پھر وہ واپس کیوں لے گا۔

غرض چار دن بعد فخرو پھر مسجد جاتا ہے اور پالش کی ڈبیا اور بُرش بھی مسجد میں چھوڑ دیتا ہے اور چوری کرنے والوں کو بُرا بھلا کہہ کر واپس چلا آتا اور کہتا ہے کہ

وہ اب کبھی مسجد میں نہیں آئے گا اور نہ ہی نماز پڑھے گا۔ ہاں اللہ سے دوسرے جوتے کیلئے دعا ضرور کرتا رہے گا۔

رضیہ سجاد ظہیر کہتی ہیں کہ وہ جب آٹھ سال کی ہوئیں تو فخرو کو جو بوڑھے ہوچکے تھے دیوڑھی میں بیٹھے کھانستے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اب پوتوں، پڑپوتوں والے ہوچکے تھے۔ نماز کے بارے میں سوال کیا جاتا تو ہنس کر ٹال دیتے لیکن کوئی ان کے چوری ہوئے جوتوں کے بارے میں یہ کہہ دیتا کہ ''اللہ کی یہی مرضی تھی'' تو وہ بھڑک جاتے اور کہتے کہ اللہ تو دینے والا ہے وہ کیوں لے گا۔ چوری تو نمازی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نماز پڑھ لی تو سات خون معاف ہوجائیں گے۔ کریں گے خود اور الزام اللہ پر دیں گے یہ کہاں کا انصاف ہے۔؟

غرض فخرو کو اپنے جوتے چوری ہوجانے کا ملال زندگی بھر رہا اور نمازیوں پر سے اُن کا بھروسہ اُٹھ گیا۔

سوال (2) رضیہ سجاد ظہیر پر ایک نوٹ لکھیئے۔

جواب: رضیہ سجاد ظہیر بحیثیت ناول نگار، افسانہ نگار، بچوں کی ادیبہ اور ترجمہ نگار اردو ادب میں مشہور و معروف ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کی پیدائش 15 / فبروری 1917ء کو اجمیر کے ایک قدامت پسند گھرانے میں ہوئی۔ رضیہ سجاد ظہیر کا پیدائشی نام رضیہ دلشاد تھا لیکن سجاد ظہیر سے شادی کے بعد وہ رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے جانی جانے لگیں۔ ابتداء سے وہ ذہین تھیں اور بی۔ اے کی تعلیم تک اوّل آتی رہیں۔ انہوں نے الہٰ آباد یونیورسٹی

سے ایم۔ اے کیا۔ انہیں چار لڑکیاں تھیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کمیونسٹ خیالات کی حامل تھیں اور سجاد ظہیر سے شادی کے بعد ترقی پسند تحریک کی رہنما بن گئیں۔ کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ میں لکچرر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ 1966ء میں انہیں نہرو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

رضیہ سجاد ظہیر کم عمری سے ہی مضامین اور کہانیاں لکھنا شروع کیا اور ان کی یہ کہانیاں بچوں کے رسالوں میں چھپتی تھیں۔ انہوں نے قلمی دوستی کے ذریعہ اردو کی مشہور ادیبہ صالحہ عابد حسین سے قریبی تعلق پیدا کرلیا۔ انہوں نے بچوں کیلئے ایک کتاب ''سلطان زین العابدین بڈشاہ'' لکھی جو بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ان کے افسانے ''نیچ''، ''اللہ دے بندہ لے''، ''بادشاہ'' اور'' زرد گلاب'' مشہور ہیں۔ ''سرشام'' ، ''کانٹے'' اور'' اللہ میگھ دے'' ان کے مشہور ناول ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کا انتقال 13 /نومبر 1973ء قزاکستان کی راجدھانی میں ہوا۔

IV. خالی جگہوں کو صحیح لفظوں سے پُر کیجیے۔

(1) رضیہ سجاد ظہیر اجمیر شہر میں پیدا ہوئیں۔

(2) فخرو کو بیرسٹر ماموں نے اردو پڑھنا لکھنا سکھایا۔

(3) فخرو کے جوتے مسجد میں چوری ہو گئے۔



5

ذرا مسکرائیے!

یوسف ناظم

I. مختصر سوالات کے جوابات لکھیئے۔

سوال (1) یوسف ناظم کس سال میں پیدا ہوئے؟

جواب: یوسف ناظم 18/ نومبر 1918ء میں پیدا ہوئے۔

سوال (2) یوسف ناظم کا اصل نام کیا ہے؟

جواب: یوسف ناظم کا اصل نام سید محمد یوسف ہے۔

سوال (3) یوسف ناظم کا انتقال کب ہوا؟

جواب: یوسف ناظم کا انتقال 23/ جولائی 2009ء کو ہوا۔

سوال (4) یوسف ناظم کے خاکوں کے مجموعوں کے نام کیا ہیں؟

جواب: یوسف ناظم کے خاکوں کے مجموعوں کے نام ''سائے ہم سائے، ذکر خیر اور علیک سلیک'' ہیں۔

II. طویل سوالات کے جوابات:

سوال(1) یوسف ناظم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟لکھیئے۔

جواب: یوسف ناظم مرہٹواڑہ کے شہر جالنہ میں 18 /نومبر 1918ء کو پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام سید محمد یوسف تھا لیکن یوسف ناظم کے نام سے اردو طنز و مزاح کے ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ جالنہ کے مقامی اسکول سے انہوں نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اورنگ آباد انٹر میڈیٹ کالج سے 1940ء میں انٹر میڈیٹ کامیاب کیا۔ 1942ء میں بی اے اور 1944ء میں اردو سے ایم اے کی ڈگریاں جامعہ عثمانیہ سے حاصل کیں۔ اسکول کے زمانے سے ہی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔لیکن 1944ء سے نثر لکھنے کی ابتداء کی اور اسی سال ریاست حیدرآباد کے محکمہ لیبر میں بحیثیت مترجم ان کا تقرر عمل میں آیا۔ تقرری کے دو سال بعد یعنی 1946ء میں حیدرآباد ہی میں اُن کی شادی ہوگئی۔ 1947ء میں ترقی پا کر لیبر آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جس وقت ریاستوں کی جدید تشکیل ہوئی تو یوسف ناظم کی خدمات حکومت مہاراشٹرا کو منتقل کردی گئیں۔ 1960ء میں اسسٹنٹ لیبر کمشنر ممبئی بنائے گئے۔ 1975ء میں ڈپٹی لیبر کمشنر کے عہدے پر ترقی کی۔ اور 1976ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن برہانی کالج بمبئی سے وابستہ ہوکر اپنی خدمات جاری رکھیں اور کئی اعلیٰ عہدوں پر اپنی خدمات انجام دیں۔

یوسف ناظم اردو کے طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔

مضامین کے مجموعوں میں کیف وکم، فٹ نوٹ، دیوار سے، زیرِ غور، بالکلیات، فی البدیہہ اور دوسرے مجموعے قابلِ ذکر ہیں۔

یوسف ناظم کے خاکوں کے مجموعوں میں سائے ہم سائے، ذکرِ خیر اور علیک سلیک بھی شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سفرنامہ ''امریکہ میری عینک سے'' اور بچوں کے لئے پانچ کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔

یوسف ناظم نے کبیر کے دوہے اور بھرتری ہردے کے کلام کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ یوسف ناظم کثرت سے لکھنے والے مزاحیہ قلم کار ہیں۔ ان کے کالم اور مضامین ملک کے مشہور اخبارات شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کو نظر میں رکھتے ہوئے ہریانہ اردو اکیڈیمی نے بھی ایوارڈ عطا کیا۔ یوسف ناظم کی شخصیت اور کارناموں پر ملک کے مختلف رسالوں نے خصوصی شمارے جاری کیئے۔ یوسف ناظم کا انتقال 23 / جولائی 2009ء کو ہوا۔

سوال (2) ''ذرا مسکرائیے'' مضمون کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیئے۔

جواب: **خلاصہ** : یوسف ناظم ہمارے ملک کے مشہور مزاح نگار ہیں۔ جن کی تحریریں شگفتہ اور طنز و مزاح سے بھرپور ہوتی ہیں۔ اپنے اس مضمون میں انہوں نے فوٹو گرافروں کا نقشہ بہت ہی دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فوٹو گرافر ہی سماج کا واحد ایسا شخص ہوتا ہے جو کسی بھی محفل میں چاہے وہ سرکاری ہو غیر سرکاری، مشاعرہ ہو یا سمینار، قوالی ہو یا سیاسی جلسہ، بغیر اجازت اور بغیر ٹکٹ آسانی

سے اندر داخل ہوسکتا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ وہ طنز گویا مزاح نگار نہ ہونے کے باوجود سب کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے اور سب لوگ کسی ملٹری آفیسر کے حکم کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ فوٹو گرافر اتنے بااختیار ہوتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق لوگوں کو امیر غریب ، اعلیٰ وادنیٰ میں تقسیم کر دیتے ہیں، غریبوں کو نیچے بیٹھنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور کرسیوں پر ظاہری طور پر پڑھے لکھے اور خاندانی نظر آنے والوں کو بٹھایا جاتا ہے اور کرسیوں کے پیچھے ایسے لوگوں کو کھڑا کیا جاتا ہے جو اپنے انداز ہی سے وظیفہ یاب لگتے ہیں اور پھر کسی کو مسکرانے اور کسی کو نہ مسکرانے سے روک دینے کا اختیار بھی انہیں حاصل ہوتا ہے اور کسی کی مجال یا ہمت نہیں ہوتی کہ وہ فوٹو گرافر کے حکم کی روگردانی کرے۔ عام طور پر فوٹو گرافر ، شاعروں کا طریقہ اپناتے ہوئے ہر تصویر کو دو دو مرتبہ کھینچتے ہیں تا کہ کسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔

آگے چل کر یوسف ناظم فرماتے ہیں کہ فوٹو گرافر اور شاعر میں دو فرق واضح ہوتے ہیں ایک یہ کہ فوٹو گرافر شاعر کی طرح اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا اور دوسرے یہ کہ فوٹو گرافر پرچا ہے وہ اچھا ہو یا بُرا ہوٹنگ نہیں ہوتی۔

آگے چل کر مصنف کہتے ہیں کہ آج کل فوٹو گرافر اتنا زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ صرف آپ کے راشن کارڈ میں اس کا نام موجود نہیں ہوتا ورنہ وہ لوگوں کی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا ہے کیونکہ آج کے دور میں تصویروں کی اہمیت بہت

بڑھ گئی ہے اور ہر قدم پر آدمی کو اپنی تصویر پیش کرنی پڑتی ہے چاہے وہ کوئی امتحان لکھ رہا ہو چاہے رائے دہی کے حق کا استعمال کر رہا ہو۔ چاہے نوکری کرنی ہو، چاہے پاسپورٹ بنانا چاہتا ہو یا کسی جرم کی پاداش میں گرفتار کرلیا گیا ہو۔ یا پھر اخبار میں گمشدگی کی اطلاع چھپوانی ہو یا کسی رسالے میں کوئی مضمون چھپوانا ہو۔ غرض فوٹو گرافر اور فوٹوز انسانی زندگی کیلئے لازم وملزوم ہوگئے ہیں۔

یوسف ناظم کہتے ہیں کہ تصویروں کی سماجی اہمیت بھی آجکل بہت بڑھ گئی ہے اور ہر سمجھدار آدمی ایک فوٹو گرافر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے تاکہ ہر بڑے اور اہم شخصیات کے ساتھ انہیں پھولوں کا ہار پہناتے ہوئے اس کی تصویر اُتر جائے تاکہ دوسروں پر اپنی جھوٹی حیثیت کا رعب جما سکے۔

آج کل ضرورت کی ہر چیز کے ڈبے یا بوتل ہر کسی نہ کسی کی تصویر موجود ہوتی ہے۔ الیکشن میں ہر امیدوار اپنی تصویر پوسٹروں پر چھپوانا ضروری سمجھنے لگا ہے تاکہ اس میں اس کے امتیازی نشان میں لوگ فرق کرسکیں اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

غرض فوٹو گرافر ہر جگہ آزادانہ طور پر اور جاسکتا ہے سوائے اس مقام کے جہاں مکانات بلڈوزروں کے ذریعہ ڈھائے جارہے ہوں یا کہیں عوام پر گولیاں چلائی جارہی ہوں کیونکہ فوٹو گرافر وہاں پہنچ بھی جائے تو ایسے دردناک حالات میں وہ کسی سے مسکرانے کے لئے کہہ سکتا ہے۔

III. متن کے حوالے سے جملہ کی تشریح کیجیے۔

(1) ''فوٹوگرافر نہ تو مزاح گو ہوتا ہے نہ طنزنگار، لیکن اس کے باوجود وہ سب کو مسکرانے پر مجبور کرسکتا ہے۔''

تشریح: یہ جملہ یوسف ناظم کے انشائیہ ''ذرا مسکرائیے'' سے لیا گیا ہے۔ اپنے اس انشائیے میں یوسف ناظم فوٹوگرافر کے اختیارات پر بڑے ہی مزاحیہ انداز میں طنز کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فوٹوگرافر نہ تو مزاح گو ہوتا ہے نہ طنزنگار، لیکن اس کے باوجود وہ سب کو مسکرانے پر مجبور کرسکتا ہے۔ وہ جب کہتا ہے کہ ذرا مسکرائیے تو سب چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگتے ہیں کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ اگر نہ مسکرائیں تو تصویر اچھی نہیں آئیگی۔ یوسف ناظم کے خیال میں ہنسانا مزاح گویا طنزنگار کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی تحریروں کے ذریعہ مسکرانے پر مجبور کریں لیکن ایک فوٹوگرافر اپنے ایک ہی لفظ کے ذریعہ سب کو مسکرانے پر مجبور کردیتا ہے۔

(2) ''اب ہر قدم پر آدمی کو اپنی تصویر پیش کرنی پڑتی ہے، خواہ اس کا چہرہ تصویر کے لائق ہو یا نہ ہو۔''

تشریح: دیا گیا جملہ یوسف ناظم کے انشائیے ''ذرا مسکرائیے'' سے لیا گیا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں ہر کام کے لئے تصویر ضروری ہوگئی ہے۔ چاہے امتحان لکھنا ہو، شناختی کارڈ بنانا ہو، سرکاری ملازمت کرنا ہو یا پاسپورٹ بنانا ہو، تصویر

ضروری قرار دی گئی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بعض چہرے تصویر کے لائق نہیں ہوتے پھر بھی مجبوراً اسے اپنی تصویر پیش کرنا پڑتا ہے۔ اور چہرہ کو لائق بنانے کا کام فوٹوگرافر کرنے لگے ہیں اسی لیئے سماج میں فوٹوگرافر کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

IV. خالی جگہوں کو صحیح جوابات سے پُر کیجیے۔

(1) ذرا مسکرائیے مزاحیہ مضمون یوسف ناظم نے لکھا ہے۔

(2) یوسف ناظم کے مضامین کے ایک مجموعے کا نام کیف وکم ہے۔

(3) امریکہ میری عینک سے یوسف ناظم کا سفرنامہ ہے۔

(4) کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ یوسف ناظم کو ملا۔



6

چھوٹی آپا

سلیمان اطہر جاوید

I. مندرجہ ذیل کی بحوالہ متن تشریح کیجیے۔

(1) جب ماں مرتی ہے تو ماں نہیں مرتی، بہن کے وجود میں زندہ رہتی ہے۔

تشریح : دیا گیا جملہ سلیمان اطہر جاوید کے مضمون ''چھوٹی آپا'' سے لیا گیا ہے۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ ماں مر کر بھی کسی نہ کسی وجود میں زندہ رہتی ہے اور خاص طور پر چاہنے والی بہن ماں کا روپ ہوتی ہے۔ مصنف کو بھی اپنی مرحوم ماں کا وجود اپنی چھوٹی بہن میں نمایاں نظر آتا تھا۔ بہن کی آواز، سیرت و کردار، اُن کی نرمی، مٹھاس اور مصنف کے شرارت یا شوخی کرنے پر پیٹھ پر دھپ سے مارنے کی اُن کی عادت سب کچھ ماں جیسا تھا۔ اسی لیئے مصنف کو بہن کی آخری سانس تک اپنی ماں کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ انہیں اپنی بہن میں ماں کا وجود نظر آتا تھا۔ اسی لیئے وہ کہتے ہیں کہ جب ماں مرتی ہے تو ماں نہیں مرتی، بہن کے وجود میں زندہ رہتی ہے۔

(2) ''چھوٹی آپا نے بھی تعلیم حاصل کی لیکن میٹرک کے بعد والدین نے اُن کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرا دیا۔''

تشریح: یہ جملہ خاکہ'' چھوٹی آپا'' سے لیا گیا ہے اور خاکہ نگار سلیمان اطہر جاوید ہیں۔ انہوں نے اپنے خاکے میں اپنی چھوٹی بہن کی شخصیت کا خاکہ بڑے ہی موثر انداز میں کھینچا ہے وہ اپنی بہن کو چھوٹی آپا کہتے اور ان کی شخصیت میں مصنف اپنی ماں کے وجود کو محسوس کرتے۔ اپنی بہن کے ایثار، محبت، سیرت و کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چھوٹی آپا صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر پائیں کیونکہ میٹرک کے بعد والدین نے اُن کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کروا دیا۔ لیکن چھوٹی آپا نے کوئی احتجاج نہیں کیا وہ مطمئن تھیں اور خوش تھیں جیسے انہوں نے میٹرک کی نہیں بلکہ کوئی بڑی ڈگری حاصل کر لی ہو۔ اپنی تعلیم کی کمی کو وہ اپنے بھائی سلیمان اطہر جاوید کی تعلیمی ضروریات میں مدد کر کے پورا کر لیا کرتیں۔

(3) ''ہم دونوں کو والدین سے کبھی کبھار جو پیسے ملتے تھے انہیں جوڑ کر ہم نے کچھ روپئے بنا لیئے۔''

تشریح: دیا گیا جملہ مضمون'' چھوٹی آپا'' سے لیا گیا ہے۔ جس کے مصنف سلیمان اطہر جاوید ہیں۔ مصنف اپنے بچپن کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن کے ماں باپ انہیں اور ان کی چھوٹی آپا کو کبھی کبھار کچھ پیسے دے دیا کرتے اور

دونوں نے انہیں جوڑ کر کچھ روپے بنا لیئے۔ جمع روپیوں کو خرچ کرنے کیلئے مختلف منصوبے بنائے جاتے لیکن ایک دن دونوں نے محلے میں مٹھائی بیچنے والے سے مٹھائی خرید کر کھانے کا منصوبہ بنایا اور دونوں نے مٹھائی خرید کر کھائی اور اپنے دوستوں کو بھی کھلائی۔ دوسرے دن اُن کی جمع رقم ختم ہوگئی۔ کئی دنوں کی جمع کردہ رقم کا یوں صرف دونوں میں ختم ہوجانے پر انہیں بہت افسوس ہوا۔ اور کئی دنوں تک وہ افسوس کرتے رہے۔ رقم اتنی بڑی نہیں تھی لیکن بچپن کی یہ سوچ تھی کہ وہ اس رقم کو بہت بڑی سمجھتے تھے۔

(4) ''کبھی میں ان کی بات مان لیتا، کبھی وہ میری سن لیتیں''۔

تشریح : دیا گیا جملہ سلیمان اطہر جاوید کے مضمون ''چھوٹی آپا'' سے لیا گیا ہے۔ سلیمان اطہر جاوید نے اپنے اور اپنی بہن ''چھوٹی آپا'' کے بچپن سے لے کر اُن کے انتقال تک کے واقعات کو بڑے ہی موثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چھوٹی آپا اُنہیں بے انتہا چاہتی تھیں اُن کی ہر بات کا خیال رکھتی تھیں اور کبھی کبھی ناراض بھی ہوجاتی تو سلیمان اطہر جاوید اُنہیں کسی طرح منا لیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لڑائی جھگڑے، روٹھنے منانے کے درمیان کبھی مصنف اپنی بہن کی بات مان لیتے تو کبھی ان کی بہن چھوٹی آپا، اپنے بھائی کی بات مان لیتیں۔ اسی طرح زندگی محبتوں، چاہتوں اور گلے شکوؤں کے درمیان گزرتی رہی۔

- **مختصر سوالات کے جوابات:**

سوال (1) سلیمان اطہر جاوید کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: سلیمان اطہر جاوید حیدرآباد کے محلے مستعد پورہ میں 9/اپریل 1936ء کو پیدا ہوئے۔

سوال (2) چھوٹی آپا بات کرتیں تو جاوید صاحب کو کیا محسوس ہوتا؟

جواب: چھوٹی آپا بات کرتیں تو جاوید صاحب کو محسوس ہوتا کہ اُن کی ماں بات چیت کر رہی ہیں۔

سوال (3) جاوید صاحب کی کالج کی فیس ادا کرنے کیلئے چھوٹی آپا نے کیا کیا؟

جواب: جاوید صاحب کی کالج کی فیس ادا کرنے کیلئے چھوٹی آپا نے اپنے سونے کا لاکٹ رہن رکھوا دیا۔

سوال (4) والدین سے پیسے ملنے پر دونوں کیا کرتے؟

جواب: والدین سے پیسے ملنے پر دونوں اُسے جمع کرتے اور روز نئے نئے منصوبے بناتے۔نئی نئی باتیں سوچتے۔

- **طویل سوالات کے جوابات لکھیئے۔**

سوال (1) ’’چھوٹی آپا‘‘ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیئے۔

جواب: **خلاصہ**: ’’چھوٹی آپا‘‘ سلیمان اطہر جاوید کا لکھا ہوا خاکہ ہے۔اس

خاکہ میں مصنف نے اپنی چھوٹی بہن کا خاکہ بہت ہی متاثر کن انداز میں کھینچا ہے اور اُن کا کہنا ہے کہ جب ماں مرتی ہے تو ماں نہیں مرتی بہت سے رشتوں کے وجود میں زندہ رہتی ہے۔ اور خاص طور پر بہن کے وجود میں وہ زندہ رہتی ہے اور جب بہن مرجاتی ہے تو بہن ہی نہیں مرتی بلکہ ماں بھی مرجاتی ہے۔ سلیمان اطہر جاوید اپنے بچپن اورلڑکپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اپنی منجھلی بہن جو اُن سے بڑی تھیں اُن کی خوبیوں، اُن کے برتاؤ، اُن کے بات کرنے کے انداز کاذکرکرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بالکل اُن کی ماں جیسی تھیں۔ ماں کے انتقال کے بعد مصنف نے کبھی اپنی ماں کی کمی محسوس نہیں کی کیونکہ ان کی ''چھوٹی آپا'' جب تک زندہ رہیں انہیں ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دیں۔

منصف کہتے ہیں کہ جب ''چھوٹی آپا'' بات کرتیں تو انہیں لگتا کہ ماں بول رہی ہیں وہی ماں جیسی آواز، وہی مٹھاس، وہی نرمی، ٹھہراؤ، اپنائیت، وہی رچاؤ اور پھر مصنف کی کسی شرارت یا شوخی پر محبت بھرے انداز میں اُن کی پیٹھ پر تھپ سے مارنا بالکل ماں جیسا لگتا تھا۔

مصنف کی ایک بڑی بہن بھی تھیں لیکن اُن کی شادی ہوجانے اور دوسرے شہر چلے جانے کی وجہ سے اُن سے زیادہ قربت نہیں رہی لیکن ''چھوٹی آپا'' اور مصنف میں بہت لگاؤ تھا۔ شوخیاں، شرارتیں، روٹھنا، مان لینا، ایک دوسرے کی چیزیں چھین لینا اور ایک دوسرے کو ستانا اور ایک دوسرے کے کاموں میں مدد کرنا کے علاوہ ایک دوسرے کی تکلیف میں ساتھ دینا یہ ایسی باتیں تھیں جو مصنف کو ایک

فلم کے منظر کی طرح ایک کے بعد ایک ذہن میں تازہ ہوتے چلے جاتے تھے۔

ایسے ہی ایک واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جن دنوں وہ انٹرمیڈیٹ یا بی۔اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور کالج کی فیس کیلئے گھر میں روپے نہیں تھے لیکن چھوٹی آپا نے اپنا سونے کا لاکٹ کسی رشتہ دار کے ہاں امانت رکھوا کر ان کی فیس ادا کی۔ حالانکہ چھوٹی آپا کو گھر والوں نے میٹرک کے بعد تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی تھی پھر بھی وہ خوش اور مطمئن تھیں اور گھر کے کاموں میں پوری دلچسپی سے ہاتھ بٹایا کرتیں۔ امتحان کی تیاری میں مصروف رہ کر جب مصنف کھانا کھانے سے انکار کر دیتے تو ماں پریشان ہو جاتیں اور اس کا علاج چھوٹی آپا کے پاس تھا۔ وہ رکابی میں کھانا لیتیں۔مصنف کے سامنے ٹھہر جاتی اور چہرے پر مسکراہٹ ہوتی۔سلیمان اطہر جاوید کہتے ہیں کہ چھوٹی آپا کی مسکراہٹ اور ممتا بھرا انداز ان پر جادو کر دیتا اور وہ چپ چاپ اپنی چھوٹی آپا کے ہاتھ کھانا کھالیا کرتے۔

سلیمان اطہر جاوید اور چھوٹی آپا جب کم عمر تھے تو اُن کے والدین انہیں کچھ پیسے کبھی کبھار دے دیا کرتے اور وہ دونوں انہیں جمع کر کے روپئے بنالیا کرتے اور بہت سارے منصوبے بناتے لیکن محلّے میں گھوم کر مٹھائی بیچنے والے سے مٹھائی لے کر خود بھی کھاتے اور دوستوں کو بھی کھلاتے لیکن محنت سے جمع روپیوں کے اچانک ختم ہو جانے پر انہیں بڑا دُکھ ہوتا۔

چھوٹی آپا بیماری میں مصنف کا خاص خیال رکھا کرتیں۔ بعد میں ایسا ہوا کہ چھوٹی آپا کی شادی ہوگئی اور وہ ورنگل چلی گئیں اور سلیمان اطہر جاوید نوکری کے سلسلے میں تروپتی چلے گئے اور ان بھائی بہن کی ملاقات برسوں میں ہونے لگی۔ چھوٹی آپا اپنے چہیتے بھائی سے نہ ملنے کا شکوہ کرتیں اور ورنگل آنے کی تاکید کیا کرتیں اور جب مصنف ورنگل اپنی چھوٹی آپا سے ملنے جاتے تو اُن کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں۔ چھوٹی آپا کی اولاد اُن دونوں بھائی بہن کی چاہت دیکھ کر حیرت زدہ ہوجاتی۔

مصنف کہتے ہیں کہ چھوٹی آپا کو شعروادب کا ذوق تو نہیں تھا لیکن وہ میرے لکھنے پڑھنے کی باتوں سے ہمیشہ باخبر رہتیں۔ اخبارات اور رسالوں میں میرے چھپنے والے مضامین کو محفوظ کرلیا کرتیں۔ اپنی بہن کی اچھی صحت کا ذکر کرتے ہوئے سلیمان اطہر جاوید کہتے ہیں کہ وہ بہت چاق وچوبند تھیں۔ انہوں نے اپنا گھر بڑے سلیقے سے رکھا۔ بچوں کی شادیاں بڑی آرزوؤں اور اہتمام سے کیں۔

ہر بار روٹھنے اور ماننے والی بہن ایک دن اچانک مصنف سے ہمیشہ کیلئے روٹھ کر چلی گئیں اور مصنف کیلئے بے شمار یادیں چھوڑ گئیں لیکن مصنف کو لگتا ہے کہ وہ مری نہیں ہیں بلکہ اُن کے آس پاس ہی موجود ہے۔ تمام بھائی بہنوں کی آنکھوں میں دلوں میں اور گھر کے درو دیواروں میں بسی ہیں سلیمان اطہر جاوید کی ''چھوٹی آپا''۔

سلیمان اطہر جاوید کا یہ خاکہ ایک بھائی اور بہن کی سچی محبت کا مرقع ہے جو ہر قاری کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

سوال(2) جاوید صاحب کی مرقع نگاری کی چند خصوصیات بیان کیجیے۔

جواب: سلیمان اطہر جاوید اردو کے ایک بہترین استاد، نقاد، محقق ، شاعر اور کالم نگار گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی صحافتی خدمات اور مرقع نگاری کے ذریعہ اردو دنیا میں نام کمایا۔ وہ ایک کامیاب مرقع نگار بھی تھے۔ جس کسی کا بھی انہوں نے خاکہ لکھا اس کی تصویر قاری کے ذہن میں اُجاگر ہو جاتی ہے۔ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اُس خاکے کا ایک کردار ہے اور اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو خاکہ نگار دکھانا چاہتا ہے۔

سلیمان اطہر جاوید کے خاکے ''چھوٹی آپا'' کے مطالعہ سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم مصنف اور ان کی بہن کو اپنے سامنے ہی چلتے پھرتے، ایک دوسرے سے لڑتے، شرارتیں کرتے دیکھ رہے ہیں۔ مصنف کی خوبی یہ ہے کہ وہ خاکہ میں موجود شخصیت کے نقوش اس طرح اُبھارتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک جیتی جاگتی تصویر اُبھر کر آ جاتی ہے۔ مصنف نے اپنی بہن کی زندگی کے حالات، خوشی وغم کے ملے جلے احساسات ، کمزوریاں اور خوبیاں ، گلے شکوؤں کی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ اس خاکے کو پڑھتے ہوئے قاری کبھی خوشی محسوس کرتا ہے تو کبھی اداس ہو جاتا ہے اور اس کی ہمدردیاں خاکہ نگار اور کرداروں کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔

ہم بلامبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ سلیمان اطہر جاوید ایک کامیاب مرقع نگار کہے جانے کے مستحق ہیں۔

- **خالی جگہوں کو صحیح لفظوں سے پُر کیجیے۔**

(1) جاوید صاحب سری وینکٹیشورا یونیورسٹی میں استاد رہے۔

(2) چھوٹی آپا عمر میں جاوید صاحب سے بڑی تھیں۔

(3) چھوٹی آپا شادی کے بعد ورنگل شہر میں رہتی تھیں۔



حصۂ قواعد

- انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کیجیے۔

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
Moon	چاند۔قمر	Poetess	شاعرہ
Old	پرانہ۔قدیم	Poet	شاعر
Literature	ادب	Author	مصنف
Dog	کتا	Emperor	بادشاہ۔شہنشاہ
Small	چھوٹا۔صغیر	Host	میزبان۔داعی
Hope	امید۔آس	Person	شخص۔آدمی
Field	کھیت۔میدان	Gentleman	شریف آدمی/باتہذیب
Character	کردار	Rich man	مال دار۔دولتمند
God	خدا۔اللہ	Control	قابو
Nature	فطرت۔قدرت	Promise	وعدہ
Paper	کاغذ۔قرطاس	Judge	منصف۔جج
Window	کھڑکی۔دریچہ	Ashemed	شرمندگی۔ندامت

English	اردو	English	اردو
Face	چہرہ۔رُخ	Trouble	پریشانی۔مشکل
Wife	بیوی۔اہلیہ	Fool	احمق۔نادان
Life	زندگی۔حیات	Search	تلاش۔جستجو
Rope	رسّی۔ڈوری	Kindness	رحم دلی۔مہربانی
Tomorrow	کل۔آنے والا دن	Misfortune	بدقسمتی۔بدنصیبی
Whole Life	پوری زندگی ۔ تمام عمر		

• سوالات

(1) صرف کی تعریف کیجیے۔

جواب: علم ''صرف'' میں الفاظ سے بحث ہوتی ہے اور الفاظ کے ذریعہ ہی ہم گفتگو کرتے ہیں اوران ہی الفاظ کو لکھنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ جملے کا کم ازکم جزو ہوتا ہے۔ ہر لفظ کے کوئی نہ کوئی معنی ضرور ہوتے ہیں۔ اوران الفاظ کے اصل اور صحیح معنی بول چال میں آنے سے معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ دوقسم کے ہوتے ہیں ایک بامعنی لفظ اور دوسرے بے معنی لفظ۔ بامعنی لفظ کو ''کلمہ'' کہا جاتا ہے اور بے معنی لفظ کو ''مہمل'' کہتے ہیں۔ قواعد میں صرف بامعنی الفاظ سے بحث کی جاتی ہے الفاظ کی اسی بحث کو علم صرف کہا جاتا ہے۔

(2) کلمہ کسے کہتے ہیں اوراس کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب: بامعنی لفظ کو''کلمہ'' کہتے ہیں اور''کلمہ'' کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

(1) مستقل کلمہ (2) غیر مستقل کلمہ

مستقل کلمہ اُن بامعنی لفظ کو کہتے ہیں جو بغیرِ کسی دوسرے کلمہ کی مدد کے اپنے معنی آپ دے۔ جیسے کتاب، الماری، گھڑی، اکمل، افسر، کھایا، گیا، سویا وغیرہ اور غیر مستقل کلمہ اسے کہا جاتا ہے جو اپنے آپ سے کوئی معنی نہ دے، لیکن جب دوسرے کلمہ کے ساتھ آئے تو معنی دے۔ جیسے کا، کی، کے، نے، سے، پر، میں وغیرہ

(3) ذیل میں دیئے گئے ان کے خاص ناموں سے اسمِ خاص کی قسموں کو جوڑیئے۔

(الف)	علم	(1) مرزا نوشہ	(3) اسداللہ خاں
(ب)	عرف	(2) غالبؔ	(1) مرزا نوشہ
(ج)	لقب	(3) اسداللہ خان	(4) شاعرِ مشرق
(د)	خطاب	(4) شاعرِ مشرق	(5) سرؔ
(ہ)	تخلص	(5) سر	(2) غالبؔ

(4) اسم عام کی تعریف کیجیے اور مثالیں بھی درج کیجیے۔

جواب: اسم عام ایک ہی قسم کی ہر چیز کے لئے استعمال ہونے والے کلمہ کو کہتے ہیں جیسے لڑکا، کتاب، پھول، پرندہ، چاقو، عمارت، کرسی، ترکاری وغیرہ اسم عام کی پانچ

قسمیں ہوتی ہیں۔اسم ذات، اسم ظرف، اسم آلہ، اسم کیفیت اور اسم جمع۔

(5) ذیل کے جملوں میں اسم عام کی نشاندہی کیجیے!

(1) زندگی کے ہر شعبے میں سائنس کا اثر نظر آتا ہے۔ ...... سائنس

(2) احمد ہر روز سویرے اسکول جاتا ہے۔ ...... اسکول

(3) شام کو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ...... شام

(4) انجمن کے جلسے میں کئی شاعر موجود تھے۔ ...... شاعر

(5) اس کا قلم، تلوار سے تیز چلتا ہے۔ ...... قلم

(6) ضمیر کی تعریف کیجیے اور اس کی قسموں کے نام بتائیے؟

جواب: اسم کے بدلے جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اسے ''ضمیر'' کہتے ہیں۔ جیسے میں، آپ، ہم، تو، تم، وہ، اُس، یہ وغیرہ۔ضمیر کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں۔

(1) ضمیر شخصی (2) ضمیر موصولہ (3) ضمیر استفہامیہ (4) ضمیر اشارہ (5) ضمیر تنکیر

(7) ذیل کے الفاظ میں اسم عام اور اسمِ خاص کی شناخت کیجیے۔

(1) دوا : اسمِ عام (2) چار مینار : اسمِ خاص

(3) ابوالکلام : اسمِ خاص (4) بستی : اسمِ عام

(5) اکبر بادشاہ : اسمِ خاص (6) قبر : اسمِ عام

(7) گل : اسمِ عام (8) تاج محل : اسمِ خاص

(8) ذیل کے الفاظ میں مؤنث الفاظ کی مذکر بنائیے۔

(1)	دھوبن	:	دھوبی	(2)	مالن	:	مالی
(3)	چاچی	:	چاچا	(4)	نوکرانی	:	نوکر
(5)	مورتی	:	مورت	(6)	کبوتری	:	کبوتر

(9) ذیل کے جملوں میں صفت کی نشاندہی کیجیے۔

(1) افضل اچھا لڑکا ہے۔ .... اچھا

(2) یہ گہرا تالاب ہے۔ .... گہرا

(3) جاپانی لوگ محنتی ہوتے ہیں۔ .... محنتی

(4) چار کتابیں ہیں۔ .... چار

(5) دس کلو چاول ہیں۔ .... دس

(6) دو لیٹر دودھ ہے۔ .... دو لیٹر

(7) یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ .... کام

(10) درج ذیل الفاظ کو ان کی صفت سے جوڑیئے۔

(الف) چوتھی : صفت عددی (i) صفتِ ذاتی

(ب)	وہ لوگ : صفت ضمیر	(ii)	صفتِ نسبتی
(ج)	شریر : صفتِ ذاتی	(iii)	صفتِ عددی
(د)	مسلمان : صفت نسبتی	(iv)	صفتِ مقداری
(ہ)	تھوڑی شکر: صفتِ مقداری	(v)	صفتِ ضمیری

(11) صفت کی کتنی قسمیں ہیں؟ بیان کیجیے؟

جواب: صفت وہ الفاظ ہیں جن سے کسی اسم کی حالت یا کیفیت یا کمیت معلوم ہو۔ جیسے حیادارلوگ، بہادرلڑکا، ٹھنڈاپانی، دوکیلوشکر، ایک لیٹردودھ، بارہ بجے دن، پانچ سال پہلے، میٹھا سیب، نرم بستر وغیرہ۔

صفت کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں۔

جیسے: (1) صفت ذاتی (2) صفت نسبتی (3) صفت عددی

(4) صفت مقداری اور (5) صفت ضمیری۔

(12) مندرجہ ذل جملوں میں فاعل، مفعول اور فعل کی نشان دہی کیجیے۔

(1) ارشد نے خط لکھا۔ ارشد فاعل ۔ خط مفعول ۔ لکھا، فعل

(2) جمیل نے احمد کو مارا۔ جمیل فاعل ۔ احمد مفعول ۔ مارا، فعل

(3) چڑیا گھونسلا بناتی ہے۔ چڑیا فاعل ۔ گھونسلا مفعول ۔ بناتی، فعل

(13) جوڑیئے۔

(الف) اٹھنا : فعل لازم	(i)	فعل متعدی
(ب) کھانا : فعل متعدی	(ii)	فعلِ ناقص
(ج) ہونا : فعل ناقص	(iii)	فعلِ لازم

(14) معنی کے لحاظ سے فعل کی کتنی قسمیں ہیں؟ تعریف کیجیے۔

جواب: معنی کے لحاظ سے فعل کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

(1) فعلِ متعدی (2) فعلِ لازم اور (3) فعل ناقص

(1) فعل متعدی وہ فعل ہے جس کے مفہوم کوادا کرنے کیلئے فاعل کے علاوہ مفعول کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً: احمد نے امتحان لکھا، ٹیپو نے شیر کو مارا، سلمٰی گانا گارہی ہے۔

(2) فعل لازم وہ فعل کو کہا جاتا ہے جو صرف اپنے فاعل کے ساتھ مل کر پورا مطلب ادا کرے۔ مثلاً: اکبر ہنسا، عقیل آیا، نعمان لکھا وغیرہ۔

(3) فعلِ ناقص اُس فعل کو کہتے ہیں کہ جو کسی پر اثر نہ ڈالے، مگر کسی حالت یا عمل کو ظاہر کرے۔ مثلاً: یوسف دوڑ میں اوّل رہا، سلیم جاہل کا جاہل رہا، اکبر بیمار ہوا وغیرہ

(15) فعل کی تعریف کیجیے۔

جواب: فعل کسی کام کے کرنے یا ہونے کو کہتے ہیں جیسے سلمٰی سائیکل چلا رہی ہے، متین خط لکھ رہا ہے، لڑکا کھیل رہا ہے۔ امجد روٹی کھا رہا ہے۔ وغیرہ۔



1 حصہ سرسری مطالعہ

ہمدردی

سرسید احمد خان

I. سوالات کے جوابات تحریر کیجیے۔

سوال (1) مضمون ہمدردی کا خلاصہ لکھیئے۔

جواب: خلاصہ: سرسید احمد خاں جنہوں نے قوم کی اور خاص طور پر ملّت کی جو خدمت کی ہے۔شعور بیدار کیا ہے، رہنما کی ہے وہ رہتی دنیا تک بھلایا نہیں جاسکتا۔ سرسید نے ایک ایسے وقت قوم کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا جس وقت قوم وملت مایوسیوں کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی کوئی رہنمائی کرنے والا موجود نہیں تھا۔کوئی راستہ اس مایوسی سے نکلنے کا ملت کو سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔سرسید نے ملت میں شعور بیدار کرنے کی غرض سے وہ راستہ اپنایا جس کی شدید ضرورت تھی، تعلیم، ہنر، ادب کی اہمیت پر زور دیا اور فرسودہ رسم ورواج اور منفی سوچ کے خلاف مہم چلائی۔اپنے رسالہ ’’تہذیب الاخلاق‘‘ میں مختلف موضوعات پر اخلاقی وسماجی مضامین لکھ کر بھی ملت کی اصلاح کی کامیاب کوشش کی۔

مندرجہ بالا مضمون ''ہمدردی'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مضمون میں سرسید نے اہم انسانی جذبہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی مصیبت یا پریشانی میں مدد کرنا ہمدردی ہے۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ ہم دوسروں کی مدد کر کے خود بھی اپنی مدد آسائش کے وسیلہ سے کرلیتے ہیں۔ اگر کوئی ہمدردی نہیں کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنی آسائش کے وسیلہ کو نقصان پہونچاتا ہے۔

سرسید نے اپنے مضمون میں یہ بھی واضح کردیا ہے کہ دراصل ہمدردی کے لائق صرف وہی لوگ ہیں جو قدرتی طور پر پریشانی یا مصیبت میں مبتلا ہوں اور یہ پریشانی یا مصیبت کی یہ حالت اُن کے اختیار میں نہ ہو۔ اُن سے ہمدردی کرنا سچی ہمدردی کرنا ہے۔ اگر انسان اپنے کسی غلط عمل کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہو تو وہ مصیبت یا پریشانی نہیں بلکہ سزا ہے اور سزا کیلئے ہمدردی نہیں کرنی چاہیے۔

مصنف آگے وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رحم اور انسیت و ہمدردی حالانکہ ایک جیسے جذبے نظر آتے ہیں لیکن ہر ایک کا منشاء مختلف ہوتا ہے۔ جیسا کہ رحم ایک فطرتی نیکی ہے جو ہم جنس اور غیر ہم جنس دونوں کے ساتھ کی جاتی ہے کہ جبکہ انسیت یا ہمدردی کا اثر صرف ہم جنسوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی عقل رکھنے والوں میں ہی ہوتی ہے اسی لیئے انسان ہی ہمدردی کرسکتا ہے اور جس میں ہمدردی نہیں اس میں انسانیت نہیں ہے۔

ہمدردی قدرتی قاعدے کے مطابق مختلف درجات کی حامل ہوتی ہے

درجہ بہ درجہ ان میں زیادتی اور کمی واقع ہوتی ہے۔ جس قدر ہمدردی آدمی کو اپنے باپ بھائی، جورو بچے اور خونی رشتہ داروں سے ہوگی اتنی دوسرے قرابت داروں، ہم وطنوں اور دوسرے ملک کے باشندوں یا دوسری قوم کے لوگوں سے نہیں ہوگی۔ اس میں کمی آتی جائیگی۔ کیونکہ یہ قدرتی قاعدے ہیں۔ رشتہ یا فاصلہ جتنا بڑھتا جائے گا ہمدردی اتنی ہی گھٹتی جائے گی۔ جو لوگ اس قاعدے کو دھوکہ کہتے ہیں سرسید اُن سے سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ دھوکہ ہے تو پھر انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں کیوں وہ ہمدردی نہیں؟ حقیقت میں یہ صرف ایک خیال ہے جس سے موانست پیدا ہوتی ہے اور وہی ہمدردی کا وسیلہ بنتی ہے۔اور یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ نفرت، ہمدردی کی ضد ہے جو پیدا ہوتی ہے تو باوجود قدرتی رشتہ ہونے کے وہ ہمدردی نہیں رکھتی۔

سرسید یہ بھی کہتے ہیں کہ قریبی رشتہ داروں یا جو بھی اپنے سے قریب ہے اس سے ہمدردی نہ کرنا نہایت بُری عادت ہے اور جو سزا کے قابل بھی ہے کیونکہ یہ قدرتی قاعدے کو توڑنے کے مماثل ہے۔دور رہنے والوں یا دور کے رشتہ داروں سے ہمدردی نہ کرنا قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ یہ قدرتی قاعدے کے خلاف نہیں ہے۔اگر ہم دور والوں سے بھی ہمدردی کرتے ہیں تو یہ نہایت اچھی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اسے پسند فرماتا ہے۔

مضمون کے آخر میں سرسید فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی انسان دھوکہ میں رہ کر جس سے ہمدردی کرنی چاہئے اُن سے غفلت برتتا ہے اور جس سے نہ کرنا اہمیت نہیں رکھتا اس سے ہمدردی جتاتا ہے لیکن اُس کا ایسا کرنا کوئی بھلائی نہیں ہے کیونکہ

یہ قدرتی قاعدے کے خلاف ہے۔ پس سچی ہمدردی وہی ہے جو قدرت کے قانون کے مطابق اور قدرت کے منشاء کی تکمیل کیلئے ہو۔

سوال (2) جذبۂ ہمدردی سے متعلق مصنف کے مختلف خیالات کا اظہار کیجیے۔

جواب: سرسید احمد خاں اپنے مضمون ''ہمدردی'' میں جذبۂ ہمدردی سے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جیسے اُن کا خیال ہے کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا ہمدردی نہیں ہے بلکہ آسائش کے وسیلہ سے اپنی مدد آپ کرنا ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ ہمدردی کا اصل مفہوم ایسی حالت کا ہونا یا واقع ہونا جو قدرتی فرحت اور راحت کے برخلاف ہو۔ یعنی سرسید سمجھتے ہیں کی اپنی غلطی یا غلط روش کی وجہ سے جو مصیبت یا پریشانی لاحق ہوتی ہے وہ دراصل مصیبت یا پریشانی نہیں بلکہ سزا ہے اور ایسی مصیبت میں ہمدردی نہیں کرنا چاہیے۔ اصلی مصیبت یعنی قدرتی طور پر آئی ہوئی مصیبت یا پریشانی میں کسی کی مدد کرنا سچی ہمدردی ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ ہمدردی صرف عقل والوں ہی میں ہوتی ہے اور عقل کا حامل صرف انسان ہوتا ہے اور ہمدردی ایک انسانی جذبہ ہے۔ جس میں ہمدردی نہیں اُس کی انسانیت میں کمی ہے۔ برخلاف ہمدردی کے رحم ایک فطرتی نیکی ہے جو ہم جنس اور غیر ہم جنس دونوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔

سرسید کا کہنا ہے کہ قدرتی قاعدے کے مطابق ہمدردی کے مختلف درجات ہیں اپنی آسائش کے وسیلوں یعنی افراد خاندان، دوست احباب، رشتہ دار،

پڑوسی، دوسرے علاقوں میں رہنے والے لوگوں جن سے انسان اپنی زندگی کی ضروریات، آرام و آسائش حاصل کرتا ہے ان درجات میں فرق آتا جاتا ہے۔ باپ بھائی، بیوی بچوں سے جو ہمدردی ہوتی ہے وہ رشتہ داروں سے نہیں ہوتی، جو رشتہ داروں سے ہوتی ہے وہ پڑوسیوں سے نہیں ہوتی یہ قدرتی قاعدہ ہے البتہ موانست یعنی کبھی کبھی دور رہنے والے سے زیادہ موانست ہوجاتی ہے برخلاف نزدیک والے کے لیکن اس میں قدرتی قاعدہ کی نفی ہوتی ہے۔

قریبی لوگوں سے ہمدردی نہ کرنے کو مصنف نہایت خراب عادت اور قابلِ سزا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ایسا کر کے قدرتی قاعدے کو توڑنے کے قصوروار ہیں۔ کیونکہ قریبوں سے ہمدردی کرنے کے لئے قدرت نے ہدایت دی ہے۔ دور والوں سے ہمدردی نہ کرنے کو قابل مذمت نہیں قرار دیا ہے۔

مضمون کے آخر میں سرسید افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن کے ساتھ ہمدردی کرنے کی تاکید کی گئی ہے لوگ اُن سے ہمدردی نہیں کرتے اور جن سے ہمدردی کرتے ہیں جو خلاف قانون قدرت ہے اور سچی ہمدردی وہی ہے جو قدرت کے منشاء و مرضی کے مطابق ہو۔



2

قدیم اردو (دکنی) میں نیچرل شاعری

نصیرالدین ہاشمیؔ

I. سوالات کے جوابات تحریر کیجیے۔

سوال (1) مضمون قدیم اردو (دکنی) میں نیچرل شاعری کا خلاصہ لکھیئے؟

جواب: خلاصہ: مضمون ''قدیم اردو (دکنی) میں نیچرل شاعری'' نصیرالدین ہاشمیؔ کا تحریر کردہ ہے۔ نصیرالدین ہاشمیؔ اپنے مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو میں منظرنگاری قدیم اردو یعنی دکنی اردو میں ابتداء سے ہی موجود ہے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ منظرنگاری انگریزی کے زیراثر اردو میں منتقل ہوئی ہے غلط ہے۔

ہاشمی نے اپنے مضمون میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، نصرتیؔ اور علی عادل شاہ شاہیؔ کے کلام کے جائیزہ کی روشنی میں دکنی شاعری کو موضوعات کے اعتبار سے وسیع اور متنوع بتایا ہے اور کہا کہ زبان مشکل ہونے کے باوجود ابتدائی دور کے ان ادبی کاوشوں کو نظرانداز نہیں کرسکتے اور نہ ہی ان کی قدروقیمت میں کوئی کمی واقع ہوسکتی ہے۔

ہاشمی کہتے ہیں کہ دکنی زبان کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کئی طرح سے منظر نگاری کی گئی ہے۔ جیسے موسم کی منظر نگاری میں بارش، گرمی سردی، بہاراور بسنت کی منظر کشی ،عیدین جیسے نوروز، شب برأت، دیوالی، کھیل تماشے وغیرہ سے متعلق بھی نظمیں ملتی ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ دکنی شعراء میں محمد قلی ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری میں منظرنگاری ووصف نگاری سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کے کلیات میں کئی نظمیں نیچرل شاعری کی تعریف میں آتی ہیں۔ محمد قلی نے نیچر کی بہت ساری چیزوں پر الگ الگ انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ موسم گرما، سرما، بسنت، نوروز، ہلال، ترکاری، پھول پھل، سالگرہ، شادی کی رسومات، شب معراج، شب برأت، عیدوتہوار، عیدغدیر، مولودالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، کنیزوں ، محلات وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

سلطان محمد قلی نے موسم بارش کو اپنی کئی نظموں میں مختلف انداز سے پیش کیا ہے جس نے نہ صرف اس کی منظرنگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس دور کی معاشرت اور تمدن سے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ محمد قلی نے رسم بارش اور اس کے آغاز سے متعلق تقریباً سولہ نظمیں لکھی ہیں۔

بسنت تہوار کو محمد قلی دھوم دھام سے مناتا تھا۔ اس تہوار کے متعلق 14 نظمیں اس کے کلیات میں موجود ہیں جو رنگینی اور برجستگی کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ شاہی ایوانوں، باغوں کی خوبصورتی، سرسبزی وشادابی،

پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے درخت، میوؤں، ترکاریوں وغیرہ پر بھی محمد قلی نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ دکن کے دوسرے زبردست شاعر نصرتی کی شاعری میں بھی ہمیں نیچرل شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اس کی مثنوی ''گلشن عشق'' میں باغ کا منظر، صبح کا سماں، چاندنی کی کیفیت، کشتی کی روانی، سردی کا حال، تمازت آفتاب کی کیفیت منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ نصرتی کی دوسری تصنیف '' علی نامہ'' میں بھی نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ بادشاہ کی تخت نشینی کا جشن، شہر کی آرائش وزیبائش، رعایا کی خوش حالی کا بیان نہایت خوبی سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ''جشن فیروزی'' اور ''ملیابار کی فتح'' پر لکھے گئے قصیدوں میں بھی منظر نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

ہاشمی کہتے ہیں کہ علی عادل شاہ شاہی، محمد قلی قطب شاہ کے بعد دوسرا بادشاہ ہے جس نے منظر نگاری اور وصف نگاری کا سرمایہ چھوڑا ہے۔

قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے دوسرے شعراء کی مثنویوں میں جابجا منظر نگاری اور وصف نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ صبح وشام، طلوع آفتاب، رات، جنگل، موسم، محل، باغ، پھول وپھل وغیرہ پر ان مثنویوں میں جو اظہار خیال کیا گیا ہے وہ نیچرل شاعری کا نہایت عمدہ اور کارآمد سرمایہ ہے۔

دکنی دور کے آخری شاعر ولی اورنگ آبادی نے اپنی نظم '' سورت'' جو گجرات کا ایک شہر ہے میں وصف نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

''قدیم اردو (دکنی) میں نیچرل شاعری'' مضمون میں نصیرالدین ہاشمی نے دکنی شعراء کے کلام کے تجزیہ کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ دکنی میں نیچرل شاعری کا بہت سا ذخیرہ موجود ہے اور اردو زبان و ادب ابتدائی دور کی ان ادبی کوششوں کا ہمیشہ احسان مند رہے گا چاہے زبان کتنی ہی ترقی یافتہ یا شستہ کیوں نہ ہوجائے اور یہ کہ منظرنگاری انگریزی ادب سے اردو میں منتقل ہوئی بالکل غلط خیال ہے۔

سوال(2) مضمون قدیم اردو(دکنی) میں نیچرل شاعری میں محمد قلی کی شاعری کے مختلف موضوعات پر روشنی ڈالیئے۔

جواب: نصیر الدین ہاشمی اپنے مضمون ''قدیم اردو(دکنی) میں نیچرل شاعری'' میں نیچرل شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نیچرل شاعری یا فطری شاعری، مناظر قدرت پر خیال آرائی اور دنیا میں موجود چیزوں کی حقیقت اور اُن کی خاص خوبیوں کو نمایاں کرنے کا نام ہے۔

دکنی شعراء میں محمد قلی ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری میں منظرنگاری سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اس نے نیچر کی کئی چیزوں پر الگ الگ طریقے سے اظہار کیا ہے۔ موسم گرما، سرما، بسنت، نوروز، ہلال عید، ترکاریوں، پھول پھل، سالگرہ، رسم جلوہ، شب معراج، عیدرمضان، عیدغدیر، مولود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وغیرہ جیسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

محمد قلی نے موسم بارش کو اپنی کئی نظموں میں مختلف انداز سے پیش کیا ہے جس سے نہ صرف منظر نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس دور کی معاشرت اور تمدن سے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔قلی نے بارش کے موسم اور اس کے آغاز سے متعلق تقریباً سولہ نظمیں لکھی ہیں۔

بسنت بہار پر جس کو ہندو لوگ موسم بہار کے آغاز پر مناتے ہیں جس میں کثرت سے پھول کھلتے ہیں۔محمد قلی اس تقریب کو بہت دھوم سے مناتا تھا۔ بسنت سے متعلق 14 نظمیں اس کے کلیات میں موجود ہیں جو رنگینی اور برجستگی کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ بسنت کے موقع پر محل ایوان اور باغوں میں پھولوں کے انبار لگا دیئے جاتے۔حوضوں کو رنگوں سے بھر دیا جاتا رنگ کھیلے جاتے ہیں۔ شب برأت کے عنوان پر محمد قلی کی دس نظمیں ملتی ہیں جس میں کثرت سے روشنی اور آتشبازی کا ذکر ملتا ہے۔

اس کے علاوہ شاہی ایوانوں، باغوں کی خوبصورتی، سرسبزی اور شادابی، پھلوں اور پھولوں سے لدے درخت، میوؤں، ترکاریوں وغیرہ پر بھی محمد قلی نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔

غرض محمد قلی نے بے شمار موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے یہاں تک کہ کنیزوں اور محلات پر بھی نظمیں لکھیں ہیں۔



3

کھویا ہوا چاند

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

I. سوالات کے جوابات:

سوال (1) مضمون کھویا ہوا چاند کا خلاصہ لکھیئے۔

جواب: **خلاصہ**: ''مضمون کھویا ہوا چاند'' ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا لکھا ہوا ہے۔ اپنے اس مضمون میں زورؔ صاحب نے ہر سال محرم کے مہینے میں حیدر آباد میں منعقد کی جانے والی ایک رسم کو قطب شاہی دور میں ملکہ حیات بخشی بیگم کی جانب سے اپنے بیٹے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی زندگی کی سلامتی کے لئے مانگی گئی ایک منت کی تفصیل بیان کی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں کہ بھاگیہ نگر میں بہنے والی موسیٰ ندی ہر سال اپنے غیض وغضب کے ذریعہ جہاں مادّی نقصان پہنچاتی وہیں موسیٰ ندی کے کنارے بسنے والوں میں زندگی اور عمل کی سوئی ہوئی قوتوں کے لئے تازیانہ کا کام بھی کرتی۔ انھی طغیانیوں نے گولکنڈہ کو مغلوں کے حملوں سے کافی عرصے تک بچائے رکھا۔ موسیٰ ندی پر گولکنڈہ اور موضع چچلم کے درمیان ایک عالیشان پُل تعمیر کیا گیا جو حیدر آباد کی تعمیر کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔

زورؔ صاحب لکھتے ہیں کہ موسیٰ ندی کے کنارے بسنے والوں نے بقرعید کی خوشیاں منائی اور دعوتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ موسیٰ ندی کا پانی یکا یک غیر معمولی رفتار سے بڑھنے لگا۔ اور یہ کوئی نئ بات نہیں تھی کیونکہ لوگ ان طغیانیوں کے عادی ہو چکے تھے لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ سلطنت کے نوعمر بادشاہ عبداللہ مرزا کو ابھی تخت نشین ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اُن کی جان خطرہ میں پڑ گئی۔ ہوا یوں کہ سلطنت میں موجود شاہی ہاتھیوں جو ہمیشہ طلائی زیورات سے لدے ہوئے اور لوگ انہیں دیکھنے کے لئے جوق درجوق آیا کرتے تھے انہیں میں سے ایک ہاتھی مورت پر سوار ہو کر سلطان عبداللہ، ندی محل جو موسیٰ ندی کے کنارے واقع تھا بقرعید کی خوشیاں منا کر گولکنڈہ لوٹ رہے تھے۔ ہاتھی حسینی علم اور کوچہ صورت و مورت سے گزر کر پُل کے دروازہ پر پہنچا تھا کہ وہاں موسیٰ ندی کی تیز موجیں اس کے پاؤں سے ٹکرانے لگیں۔ ہاتھی وہیں ٹھہر گیا۔ مہاوت کے لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ آگے نہ بڑھا۔ مہاوت نے انکس چبھو کر آگے بڑھانا چاہا۔ گھوڑے اور فوجی سب نے مل کر اُسے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ ان تمام حرکتوں سے ہاتھی پریشان ہو گیا اور غصہ میں آکر مہارت کو اپنی سونڈ میں اٹھا کر پٹک دیا اور پاؤں سے کچل دیا۔ اور غصہ میں دو تین راستہ چلنے والوں کو بھی کچل کر بے تحاشا جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان عبداللہ کی جان بچانے کی کوشش رائیگاں ہوگئی اور ہاتھی اپنے اوپر سوار سلطان کو لے کر جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور قلعہ میں بادشاہ کی ماں حیات بخشی

بیگم کو جب یہ روح فرسا اطلاع پہنچی تو محلات میں کہرام مچ گیا۔ سب کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ کم عمر بادشاہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

گولکنڈہ کی تمام فوجیں ہاتھی کو ڈھونڈنے بھاگ نگر کے چپہ چپہ میں تلاش شروع کردی۔ صبح سے شام ہوگئی ہاتھی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اسی دوران سلطان کی سلامتی کیلئے غریبوں محتاجوں میں کثرت سے کھانا کپڑے اور سونا چاندی خیرات کیئے جانے لگے۔ سلطان کو ڈھونڈ نکالنے والے کو انعام سے سرفراز کرنے کا اعلان بار بار کیا جانے لگا۔ حیات بخشی بیگم کا برا حال تھا وہ رو رو کر نڈھال ہو چکی تھیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ بھاگ نگر کے اطراف دور دور تک درختوں کی شاخوں پر کھانے پینے کا سامان لٹکا دیا جائے تاکہ بھوکا شہزادہ اُدھر سے گزرے تو یہ سامان اس کے کام آئے۔

اسی طرح تین چار دن اور گزر گئے ملکہ محل سے باہر کی طرف نظریں جمائے بیٹھی رہیں اتنے میں اُن کی نظر محرم کے چاند پر پڑی اور انہیں اپنا کھویا ہوا چاند یاد آ گیا وہ بے اختیار رونے لگیں اور اچانک اُن کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور سیدالشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں منت مانگوں۔ فوراً ہی انہوں نے منت مانگی کہ اگر اُن کا کھویا ہوا چاند صحیح سلامت واپس محل آجاتا ہے تو اس کے محل میں داخل ہونے سے پہلے چالیس مَن سونے کی زنجیر اُس مست ہاتھی کے پاؤں میں لنگر کر کے اور عبداللہ کی کمر میں

باندھ کر قلعہ گولکنڈہ سے حسینی علم تک شہزادہ کو پیدل لے جاؤں گی اور فقراء وغریبوں میں ضروریات کا سامان تقسیم کروں گی۔

منت مانگنے کی دوسری صبح ملکہ نے دیکھا کہ عوام کا ہجوم قلعہ کے دروازہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور تیز رفتار گھوڑے فصیل کی طرف دوڑتے چلے آئے اور جھروکے کے نیچے آکر حیات بخشی بیگم کو مبارکباد پیش کی اور خوش خبری سنائی کہ سلطان عبداللہ قطب شاہ خیر و عافیت کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔

ملکہ خوش ہوگئیں اور حکم دیا کہ سلطان کو بالا حصار کے اندر نہ آنے دیا جائے دروازہ پر ہی روک دیا جائے۔ اور پھر سینکڑوں سناروں کے ذریعہ چالیس من کی زنجیر بنوائی گئی، چالیس من مصری کا شربت تیار کروایا گیا۔ قلعہ سے دروازہ حسینی علم تک سرخ مخمل کا فرش کروا کر سلطان کے کمر میں زنجیر باندھ کر پیدل حسینی علم روانہ کیا گیا۔ اور اس طرح ملکہ نے اپنی منت پوری کی۔

اس وقت سے اب تک ہر سال محرم کے مہینے میں عقیدت مندوں کی طرف حسینی علم میں لنگر داخل ہوتے ہیں اور حیات بخشی بیگم کی یہ منت آج بھی جاری ہے۔

غرض مضمون ''کھویا ہوا چاند'' میں مصنف نے ایک ماں کی جانب سے اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی زندگی کی سلامتی کی جو منت مانگی تھی اور اُسے پورا بھی کیا۔ اور اس منت کو آج بھی عقیدت مند حیات بخشی بیگم اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی یادگار کے طور پر ڈھٹی بی بی کے علم پر چڑھاتے ہیں۔

سوال (2) مضمون ''کھویا ہوا چاند'' میں حیات بخشی بیگم کے کردار پر روشنی ڈالیئے۔

جواب: حیات بخشی بیگم جو قطب شاہی دور کے سب سے ہر دلعزیز اور عوامی بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی تھی۔ جو بعد میں محمد قلی کی وفات کے بعد اپنے بیٹے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی کم عمری میں تخت نشینی کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھی۔ سلطنت کی رعایا انہیں محبت سے ماں صاحب پکارا کرتی تھیں۔ وہ سلطنت کی ترقی اور شہزادہ کی تربیت دونوں ذمہ داریاں بہ خوبی نبھا رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے اور سلطنت قطب شاہی کے واحد چشم و چراغ عبداللہ قطب شاہ سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔

جس وقت کم عمر سلطان عبداللہ قطب شاہ کو بہکا ہوا شاہی ہاتھی صورت اپنی پیٹھ پر سوار لے کر جنگلوں کی طرف بھاگ جاتا ہے اور یہ اطلاع جس وقت ان کی ماں حیات بخشی بیگم کو ملتی ہے تو وہ غم سے نڈھال ہو جاتی ہیں اور اپنے چہیتے بیٹے کی زندگی کیلیئے دعائیں مانگتی ہیں، خیر خیرات کرتی ہیں، منتیں مانگتی ہیں۔ بھوکی پیاسی اپنے بیٹے کی صحیح سلامت واپسی کے انتظار میں رہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ سلطنت کا سارا خزانہ بھی لٹ جائے تو کوئی افسوس نہیں بلکہ اُن کا چہیتا صحیح سلامت واپس آنا چاہیے۔ اس کے لئے وہ ہر طرح کے جتن کرتی ہیں اور بالآخر اُن کی دعائیں رنگ لاتی ہیں اور چوتھے روز سلطان عبداللہ بخیر و عافیت واپس محل آتے ہیں۔ اس وقت بھی ملکہ کی خوشی دیکھنے لائق ہوتی ہے اور وہ اپنی مانگی ہوئی منت کو پہلے پوری کرتی

ہیں تب کہیں جا کر سلطان کو گلے لگاتی ہیں۔

ملکہ حیات بخشی بیگم کا کردار تین طرح سے اُبھر کر سامنے آتا ہے ایک تو سلطنت کی ملکہ کے روپ میں جس میں وقار بردباری اور امور سلطنت کی جھلکیاں ملتی ہیں، دوسرے اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت کرنے والی ماں کے روپ میں جو بیٹے کی زندگی کیلئے سب کچھ قربان کردینے کا جذبہ لئے ہوئے۔ تیسرے آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بے پناہ عقیدت رکھنے والی عقیدت مند عورت کے روپ میں۔

غرض ملکہ حیات بخشی بیگم کا کردار ایک مرکزی اور یادگار کردار ہے۔

سوال(3) مضمون ''کھویا ہوا چاند'' میں قدیم رسم کو احترام سے کیوں اور کس لئے منایا جاتا تھا؟

جواب: مضمون ''کھویا ہوا چاند'' میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے سلطنت قطب شاہی کے دور کی ایک عقیدت مندانہ رسم کو احترام سے منائے جانے کا اصل پس منظر یا واقعہ کو بیان کیا ہے۔

حیدرآباد کے حسینی علم محلّے میں جہاں عقیدت واحترام سے بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام سے علَم بٹھائے جاتے اور عوام بڑی عقیدت سے ان علموں پر ڈھٹی چڑھاتے اور لنگر لاتے ہیں وہیں قریب میں قطب شاہی دور کے دو

شاہی ہاتھی صورت مورت بھی رکھے جاتے تھے۔اس علاقے کو کوچہ صورت مورت کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ایک سال حیات بخشی بیگم کے دور میں موسیٰ ندی میں بھیانک طغیانی آئی اور کم عمر شہزادہ سلطان عبداللہ قطب شاہ موسیٰ ندی کے کنارے بسے ندی محل سے بقرعید منا کر واپس مورت نامی شاہی ہاتھی پر سوار ہو کر قلعہ گولکنڈہ جا رہا تھا کہ ندی پر بنائے گئے پُل پر موسیٰ ندی کا پانی ہاتھی کے پیروں سے ٹکرانے لگا اور ہاتھی رک گیا۔مہاوت کے لاکھ اُکسانے پر بھی وہ نہ مانا اور مہارت کو نیچے گرا کر کچل دیا اور جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔شہزادے کی ماں اپنے بیٹے کی اس طرح گمشدگی پر پریشان ہو اٹھی اور انہوں نے اپنے لختِ جگر کی صحیح سلامت واپسی کے لئے تمام جتن کر ڈالے اور محرم کا چاند دیکھ کر انہوں نے بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کا واسطہ دیکر اللہ سے دعا کی کہ اگر اُن کا بیٹا صحیح سلامت محل واپس آجائے تو وہ چالیس من سونے کی زنجیر بنا کر اُس سرکش ہاتھی کے پیر میں ڈال کر اور شہزادہ کو پیدل حسینی علم بھیجے گی اور وہاں غریبوں اور مسکینوں میں خیر خیرات کریں گی۔

چوتھے روز حیات بخشی بیگم کی مراد پوری ہوتی ہے اور شہزادہ صحیح سلامت محل پہنچ جاتا ہے۔لیکن ماں صاحبہ محل میں اپنے بیٹے کو داخل ہونے نہیں دیتیں اور اپنی منت کے مطابق سونے کی زنجیر شہزادے کے کمر میں باندھ کر انہیں حسینی علم روانہ کرتی ہیں۔اس طرح یہ رسم قطب شاہی دور سے آج تک بڑی عقیدت و

احترام کے ساتھ محرم کے مہینے میں ادا کی جاتی ہے ۔ بی بی کے علم پر لنگر لگائے جاتے ہیں۔ اور ڈھٹیاں چڑھائی جاتی ہیں اور یہ قدیم رسم بڑی عقیدت کے ساتھ تازہ کی جاتی ہیں۔

سوال(4) موسیٰ ندی کی طغیانی کے اثرات کا مفصل جائزہ لیجیے۔

جواب: موسیٰ ندی جو حیدرآباد شہر کے درمیان بہتی ہے اس پر موجودہ دور میں کئی پُل عوام کی آمدورفت کیلئے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن قطب شاہی دور میں ابراہیم قطب شاہ کے دور میں صرف ایک پُل تعمیر ہوا تھا۔ اس پُل کی تعمیر کا مقصد موسیٰ ندی میں ہر سال آنے والی طغیانی کے اثرات سے عوام کو محفوظ رکھنا اور آمدورفت میں سہولت پیدا کرنا تھا۔ لیکن موسیٰ ندی میں آنے والی طغیانی یہاں بسے عوام کے لئے ایک پیام لے آئی کہ وہ اپنی دولت وثروت اور عیش وعشرت میں مگن نہ رہیں بلکہ خدا کی یاد بھی کرلیا کریں۔

قطب شاہی دور میں ہر سال موسیٰ ندی میں طغیانی آتی اور اس کے کنارے بنے پتھر کی دیواروں، سرسبز باغوں کی سجی ہوئی پگڈنڈیوں، بارہ دریوں، محلات کے تہ خانوں کو تباہ وبرباد کر جاتی۔ یہ طغیانیاں موسیٰ ندی کے کنارے بسنے والوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا ذریعہ بنتی۔ انہی طغیانیوں کی وجہ سے کافی عرصے تک گولکنڈہ کی سلطنت مغلوں کے حملوں سے محفوظ رہی۔ اسی طغیانی سے بچنے کیلئے گولکنڈہ اور موضع چچلم کے درمیان ایک پل تعمیر کیا گیا جو شہر حیدرآباد کی تعمیر

کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔

موسیٰ ندی کی اسی طغیانی کی وجہ سے ایک عقیدت مندانہ رسم کا بھی آغاز ہوا جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آج تک جاری ہے۔

ایک سال موسیٰ ندی میں آئی طغیانی سے پریشان ہوکر شاہی ہاتھی مورت جس پر سلطان عبداللہ قطب شاہ سوار تھے جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ سلطان کی اس طرح گمشدگی نے جیسے پوری قطب شاہی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ماں حیات بخشی بیگم اپنے بیٹے کی گمشدگی سے پریشان ہوکر ہر کوشش کرڈالی اور منت بھی مانگی۔ بالآخر چوتھے روز سلطان عبداللہ صحیح سلامت واپس محل آگئے اور حیات بخشی بیگم نے منت پوری کی۔ اور یہ رسم اس واقعہ کی یاد میں آج بھی محرم کے مہینے میں بڑی عقیدت واحترام کے ساتھ پوری کی جاتی ہے۔

یہ تمام واقعات موسیٰ ندی میں آئی طغیانی کے اثرات ہی کا نتیجہ تھے اگر اس وقت موسیٰ ندی میں طغیانی نہ آئی ہوتی اور سلطان قلعہ پہنچ جاتے تو شاید یہ واقعہ رونما ہوتا اور نہ ہی یہ رسم پوری کی جاتی۔



4

مولانا ابوالکلام آزاد

ڈاکٹر سید عابد حسین

- سوالات کے جوابات تحریر فرمائیں۔

سوال (1) سید عابد حسین کا مختصر تعارف تحریر کیجیے۔

جواب: سید عابد حسین کی پیدائش 1896ء کو بھوپال میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام خاور حسین تھا۔ عابد حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے اسکول میں حاصل کی۔ جہانگیر اسکول بھوپال سے میٹرک اور میور کالج الہ آباد سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ امتیازی قابلیت کی وجہ سے اقبالؔ اور کوین وکٹوریہ جیسے انعامات سے نوازے گئے۔ 1921ء میں جرمنی سے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی تکمیل کی۔ وہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹر ذاکر حسین سے ہوئی۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد جامعہ ملیہ سے وابستہ ہوگئے اور آخر عمر تک جڑے رہے۔ 1933ء میں اردو کی مشہور ادیبہ صالحہ عابد حسین جو خواجہ الطاف حسین حالؔی کی پڑپوتی تھیں شادی ہوگئی۔ عابد حسین نے 30 سال تک پوری ایمانداری اور خلوص سے جامعہ ملیہ کی تشکیل و ترقی میں حصہ لیا۔ ان کا انتقال 13 / ڈسمبر 1978ء کو ہوا اور جامعہ ملیہ کے قبرستان میں

ان کی تدفین عمل میں آئی۔

عابد حسین میں قومیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جو اُن کی شخصیت اُن کی تحریروں سے صاف جھلکتا تھا۔ ملک بڑے رہنماؤں جیسے مہا گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے 18 کتابیں اردو و انگریزی میں لکھیں۔ اُن کی سب سے اہم تصنیف ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' ہے جسے 1956ء میں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں'' اور ''گاندھی اور نہرو کی راہ'' قابل ذکر کتابیں ہیں۔ سلاست، صراحت اور روانی ان کی تحریروں کی خاص خوبی ہے۔

عابد حسین نے انگریزی اور جرمنی زبانوں سے تقریباً22 کتابوں کے ترجمے اُردو میں کیئے۔ جو فلسفہ، ادب، خودنوشت اور تہذیب جیسے موضوعات پر مبنی ہیں۔ ان ترجموں میں مکالمات فلاطون، گوئٹے کی فاوسٹ، ٹیگور کی کلمو ہی، مہاتما گاندھی کی خودنوشت، تلاش حق اور جواہر لال نہرو کی خودنوشت ''میری کہانی'' قابل ذکر ہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انہیں 1957ء میں پدما بھوشن کے اعزاز سے نوازا۔

سوال(2) مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاد'' کے حوالے سے مولانا آزاد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو تحریر کیجیے۔

جواب: مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہمہ جہت خوبیوں کی حامل تھی۔ مولانا آزاد

کی پیدائش مقدس شہر مکہ معظّمہ میں ہوئی تھی اور اس کے تقدس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مولانا آزاد کو خداداد صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ حالانکہ مولانا آزاد کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوئے تھے لیکن دس گیارہ برس کی عمر میں دینی اور دنیوی تعلیم میں حیرت انگریز ترقی کر لی تھی۔ ایک بہترین مقرر کی حیثیت سے کسی بھی بڑے مجمع میں پیچیدہ مسئلوں پر بھی مدلل تقریر اس طرح سلجھے ہوئے انداز میں کرتے کہ ایک عام آدمی کی بھی سمجھ میں آجائے۔

مولانا کو کچھ عرصے شاعری کا بھی شوق رہا۔ اپنا کلام اس دور کے تمام گلدستوں میں چھپنے کیلئے بھیجتے اور خود بھی ایک گلدستہ نکالنا شروع کیا لیکن وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکا۔

مولانا آزاد کو کتب بینی کا بھی بہت شوق تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کی علمی و ادبی کتابیں بڑے اہتمام سے حاصل کر کے اُن کا مطالعہ کرتے۔ مصر و شام کے عربی اخبارات کے علاوہ اردو اخبار اور رسالے بھی پابندی سے پڑھا کرتے۔ کم عمری ہی سے کتابوں کے ترجمے اور رسالوں میں مضمون لکھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں ''المصباح'' نام کے ایک ہفتہ وار رسالہ کی ایڈیٹری کی۔ بعد ازاں خود اپنا ایک سہ روزہ اخبار ''لسان الصدق'' کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ مولانا شبلی نے آزاد کی قابلیت سے متاثر ہو کر انہیں ندوۃ العلماء کے رسالے ''الندوہ'' کا مدیر مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد نے ''وکیل'' اور ''دارالسلطنت'' جو امرتسر اور کلکتہ سے نکلا کرتے تھے کے ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

مولانا آزاد عراق، شام، مصر اور ترکی کے سفر کے دوران وہاں کی انقلابی تحریکوں سے متاثر ہوئے اور انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں میں بھی آزادی کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مولانا آزاد ابتداء میں سرسید کے لبرل مذہبی خیالات یعنی نیچری مذہب سے بہت متاثر تھے لیکن بعد میں انہیں مذہب کا ایک ایسا تصور حاصل ہو گیا جو عہد جدید کی روشن خیالی کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔

مولانا آزاد نے اپنے ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' کے ذریعہ مسلمانوں کی علمی اور ادبی زندگی میں تازہ روح پھونک دی بلکہ ان میں ایک نئی مذہبی اور سیاسی بیداری بھی پیدا کردی۔ وہ چاہتے تھے مسلمان کانگریس کی قومی تحریک میں شریک ہو کر آزادی کیلئے عملی جدوجہد میں حصہ لیں۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ اسلام کی تعلیم کو عہد جدید کے لوگوں کے لئے قابل فہم اور قابلِ قبول بنایا جائے اور اِس کے انھوں نے کلام مجید کا ترجمہ کیا۔

1920ء تک مولانا آزاد زبان وقلم کے ذریعہ سیاسی سرگرمیاں انجام دے رہے تھے لیکن ساڑھے تین سال کی نظربندی سے رہائی کے بعد وہ ہندوستانی قوم اور انگریز حکومت کے درمیان جاری زبردست سیاسی کشمکش میں عملی طور پر شریک ہو گئے۔ مولانا آزاد نے خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے ترقی پسند طبقے کو نیشنل کانگریس کا ہم خیال اور حلیف بنانے اور انگریز حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قایم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو دوسرے قوم پرست ہندوستانیوں کے شانہ بہ شانہ جدوجہد میں حصہ لینے کا ماحول تیار کردیا۔ یہ

ان کی بڑی کامیابی تھی۔

مولانا نے مقدمہ کے دروان عدالت کے سامنے جوتحریری بیان دیا تھا وہ ''قولِ فیصل'' کے نام سے مشہور ہے جوآزادی کاایک روح افزا پیام تھا۔

جہاں تک مولانا آزادکی ادبی زندگی کا پہلو ہے ان کی تحریرمیں ایک خاص اُپج، انفرادیت اورپختگی پائی جاتی ہے اور ہرطرز میں ایک صاحب طرز انشاء پرداز کی حیثیت رکھتے ہیں۔مولانا آزاد کی ادبی زندگی تین دور میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلا دور12 سال کی عمر سے 28 سال کی عمرتک، دوسرا دور1916ء سے 1936ء تک اورتیسرا دور 1936ء سے 1945ء تک ان ادوار میں مولانا مضامین لکھے، شاعری کی، مختلف رسالوں اور اخباروں کی ادارت کی، خوداپنے اخبار اور رسالے جاری کیئے۔''تذکرہ'' تصنیف کیا۔قرآن مجید کے ترجمے اورتفسیرلکھی۔''غبارِخاطر'' کے عنوان سے خطوط لکھے۔

غرض مولانا ابوالکلام آزادکی شخصیت ہمہ رنگ پہلوؤں کی حامل تھی۔ وہ ایک بیباک صحافی، مستنداديب، مفسرقرآن، انشاء پرداز، مجاہدآزادی، مبلغ اسلام، ماہرتعلیم، سچے قومی رہنما، مدبر، مفکر اور سچے قوم پرست تھے اورمولانا اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیااور اپنی شخصیت کے ہرپہلو کو مؤثرانداز میں نمایاں کیا۔



5

ادب کیا ہے؟

ڈاکٹر جمیل جالبی

• سوالات کے جوابات تحریر فرمائیں۔

سوال(1) جمیل جالبی کی حیات اور اُن کے کارناموں پر مختصر نوٹ لکھیئے؟

جواب: جمیل جالبی جن کا اصل نام محمد جمیل خاں تھا۔12 / جون 1929ء کو علی گڑھ کے یوسف زئی پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد ابراہیم تھا۔ جمیل جالبی کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی، سہارن پور سے میٹرک اور میرٹھ کالج سے ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے بھائی عقیل خاں کے ساتھ کراچی چلے گئے۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں بھائیوں کے تعلیمی اخراجات کیلئے اُن کے والد ہندوستان سے رقم بھیجتے رہے۔ جمیل جالبی نے کراچی سے بی ایل اور اردو میں ایم۔اے کیا۔ پھر سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، پھر ڈی لٹ بھی کیا۔ دروان تعلیم پروفیسر شوکت سبزواری، پروفیسر غیور احمد رمزی، پروفیسر

کرار حسین، اور جالب دہلوی جیسے اساتذہ سے جمیل جالبی کو استفادہ کا موقع ملا۔ 1983ء سے 1967ء تک یعنی چار سال وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ 1978ء میں اپنے والدین کو جو ہندوستان ہی میں مقیم تھے پاکستان بلوالیا۔

جمیل جالبی نے 12 سال کی عمر ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا اُن کی پہلی تصنیف ''سکندر اور ڈاکو'' ہے جسے ڈرامائی شکل دے کر اسکول میں اسٹیج بھی کیا گیا تھا۔ آپ کی سب سے اہم تصنیف ''تاریخ ادب اردو'' ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ نے قومی انگریزی اردو لغت کی تدوین بھی کی۔ دیگر تصانیف وتالیفات میں ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' پاکستانی کلچر، قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' تنقید وتجربہ'' ''نئی تنقید''، ''ادب کلچر اور مسائل''، ''محمد میر تقی میرؔ'' میراجی وغیرہ شامل ہیں۔ صحافی کی حیثیت سے اردو روزنامہ ''ساقی'' کے چار سال تک معاون مدیر بھی رہے۔ اپنا ایک سہ ماہی ''نیا دور'' بھی جاری کیا تھا۔

جمیل جالبی کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان اور دیگر اداروں نے کئی اعزازات سے نوازا۔ ستارہ امتیاز، ہلال امتیاز، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جمیل جالبی اردو کے نامور محقق، نقاد، ماہر لسانیات اور ادبی مورخ کی حیثیت سے اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

سوال(2) مضمون ''ادب کیا ہے؟'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیئے۔

جواب: ادب کیا ہے؟

یہ مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی کا لکھا ہوا ہے۔ ادب کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ''ادب لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں میں جذبہ و فکر بھی شامل ہوتے ہیں، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعہ جذبے احساس یا فکر و خیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔ آگے وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر وہ بات جو منہ سے نکلتی ہے یا ہر وہ بات جو قلم سے ادا ہوتی ہے، ادب نہیں ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کیلئے وہ کہتے ہیں کہ عام طور پر اخبار کے کالم یا اداریہ ادب نہیں کہلاتے حالانکہ ان میں الفاظ بھی ہوتے ہیں اور اثر و تاثیر کی قوت بھی ہوتی ہے۔ جیسے عام آدمی کے لکھے ہوئے خطوط ادب کی تعریف میں نہیں آتے لیکن اس کے برخلاف غالبؔ کے خطوط ادب کی تعریف میں آتے ہیں کیونکہ ایسی تحریر کو ادب کہا جاسکتا ہے جس میں الفاظ اس ترتیب و تنظیم سے استعمال کیئے گئے ہوں کہ پڑھنے والا اس تحریر سے لطف اندوز ہو اور اس کے معنی سے مسرت حاصل کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب لفظ و معنی اس طور پر گھل مل گئے ہوں کہ ان میں ''رس'' پیدا ہو گیا ہو، یہی رس کسی تحریر کو ادب بناتا ہے۔ مطلب جمیل جالبی اس تحریر کو ادب کہتے ہیں جسے پڑھ کر مسرت ہو، ہمارے شعور اور ہمارے تجربوں

کے خزانے میں اضافہ ہو۔جس کا اثر وقتی نہیں بلکہ ابدی ہو اور جو زماں و مکاں سے آزاد ہو کر آفاقیت کا حامل ہو۔وہ کہتے ہیں کہ انہیں خصوصیات کی وجہ سے مثنوی مولانا رومؔ، دیوان حافظؔ، کلام غالبؔ، اشعار میرؔ، تخلیقاتِ شیکسپیئر اور مکالماتِ افلاطون ہمیں آج بھی متاثر کرتے ہیں۔جس تحریر میں بیک وقت اوپر بیان کی گئی خصوصیات موجود ہوں گی جمیل جالبی کی نظر میں ادب کہلائے گی۔ اور جتنی زیادہ خصوصیات ہوں گی وہ تحریر اسی اعتبار سے عظیم ادب کی تعریف میں آئے گی۔

اپنے مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ ادب زندگی میں کسی چیز کا ''بدل'' نہیں ہے۔اور اگر اس کی حیثیت کسی اور چیز کے بدل کی ہے تو پھر وہ ادب نہیں ہے۔ادب کے ذریعہ ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں۔جمیل جالبی کہتے ہیں کہ ادب زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کا نام ہے۔ادب کے ذریعہ ہم دوسروں کے تجربوں میں اس طور پر شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ ہمارے تجربے بن جاتے ہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے جمیل جالبی، شیکسپیئر،کیٹس ، اوتھیلو،لیڈی میکبتھ ، گوئٹے، ٹالسٹائی ، مولانا روم کی تحریریں اور ان کے تجربے اپنے تجربے بن جانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اسی کو ادب مانتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ دوسرے کے تجربات کا ادراک کیئے بنا زندگی تو گزاری جاسکتی ہے لیکن یہ زندگی حیوانی سطح پر بسر ہوگی اور زندگی کو صرف اپنے تجربات تک محدود کر لینا گویا اندھا کنواں بن جانا ہے۔

جمیل جالبی آگے کہتے ہیں کہ ادب آزادی کی روح کا اظہار ہے، ادب

سچائی کی تلاش کا مؤثر ذریعہ ہے۔ لفظ چونکہ دوسرے میڈیم سے زیادہ طاقتور چیز ہے اسی لئے ادب دوسرے فنون لطیفہ سے زیادہ مؤثر چیز ہے۔

جمیل جالبی، ادب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''پروست نے ایک جگہ لکھا کہ ہماری اصل زندگی ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہے، ادب کا کام یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے لے آئے اور اس طرح ہمیں خود ہم سے واقف کرادے۔ غالبؔ، سرسید، حالیؔ اور اقبالؔ نے اپنی تحریروں سے ہمیں خود ہم سے واقف کراکر اس طور پر بدلا ہے کہ ہم نے گویا نیا جنم لیا ہے۔ ادب یہی کام کرتا ہے اور یہی اس کا منصب ہے۔ ادب تنقید حیات ہے اور زندگی کے گہرے پانیوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کا نام ہے۔



6

ڈائرکٹر کا کُتّا

مجتبیٰ حسین

- سوالات کے جوابات تحریر فرمائیں۔

سوال (1) مضمون ''ڈائرکٹر کا کتّا'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیئے۔

جواب: **خلاصہ**: مضمون ''ڈائرکٹر کا کتا'' مجتبیٰ حسین کا لکھا ہوا ہے۔ مجتبیٰ حسین اردو طنز و مزاح نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے مضمون میں انہوں نے کسی آفس کے ڈائرکٹر کے کتے کی خصوصیت اُس کی اہمیت اور اس کے کھو جانے پر آفس میں برپا ہنگامے کی بڑے ہی مزاحیہ انداز میں عکاسی کی ہے۔

مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ وہ چونکہ ڈائرکٹر کا کتا تھا اس لیئے اس میں وہ تمام خصوصیات جیسے خوں خواری، رعب داب جو ڈائرکٹر میں موجود تھیں کتے میں بھی صاف جھلکتی تھیں کتا تو وہ پہلے سے ہی تھا۔ دفتر کی خاتون کلکرکوں کو دیکھ کر رال ٹپکایا کرتا۔ ڈائرکٹر کے ساتھ وہ روز کار میں بیٹھ کر آفس آیا کرتا اور پھر ڈائرکٹر کو

چھوڑ کر واپس چلا جاتا۔ مصنف کہتے ہیں کہ اُن کی اور آفس کے کسی ملازم کو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ڈائرکٹر اپنے ساتھ کتے کو کیوں لاتا ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ ڈائرکٹر اپنی شخصیت میں ''کتے کی ملاوٹ'' کر کے اپنے رعب اور دبدبہ میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ کتا بذات خود کچھ نہیں تھا لیکن اُس کے ساتھ ڈائرکٹر کا نام جڑ جانے کی وجہ سے اُس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اسی طرح ڈائرکٹر کا پرسنل اسسٹنٹ بھی کہتے ہیں کہ کُتے کی طرح خوں خوار لگتا تھا کیوں کہ وہ ڈائرکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ ورنہ کتے اور بھی ہوتے ہیں لیکن اُن کی اہمیت نہیں ہوتی۔

مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ ایک دن اتفاق سے ڈائرکٹر کا کتا کار سے اُتر کر کہیں غائب ہوگیا۔ ڈرائیور پریشان ہوگیا اور اُسے لگا کہ اگر کتا نہ ملا تو اس کی نوکری چلی جائیگی۔ اتفاق سے اُسی وقت دفتر کے ملازم ورما جی دفتر میں داخل ہو رہے تھے۔ ڈرائیور نے پکار کر اُن سے ڈائرکٹر کے کتے کو ڈھونڈنے میں مدد کرنے کی درخواست کی۔ ورما جی نے سوچا کہ یہ موقع اچھا ہے کہ اپنے آپ کو کام والا ثابت کر کے اپنی پرموشن پکی کر لینی چاہیے اور ڈائرکٹر کے دل میں جگہ بنانے کیلئے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے اور کتے کو ڈھونڈ کر پکڑ لینا چاہیے۔

ڈرائیور کی پکار آفس کے اکاؤنٹنٹ نٹراجن کے کان میں بھی پڑ گئی جس

کے خلاف حساب کتاب میں خرد برد کے سلسلے میں تحقیقات کی فائیل ڈائرکٹر کے میز پر موجود تھی نٹراجن نے سوچا کیوں نا میں اس کتا کو پکڑ کر ڈائرکٹر کے دل میں ہمدردی پیدا کرلوں۔ دونوں میں مسابقت ہونے لگی نٹراجن نے کہا کہ وہ کتے کو پکڑنے کیلیئے اپنی جان کی بازی لگادیگا۔ اپنا آخری خون کا قطرہ بھی بہادیگا۔ ورماجی نے اس کے جواب میں نٹراجن سے باز رہنے کو کہا اور بیچ میں نہ آنے کی دھمکی دی۔

غرض ڈرائیور، ورماجی اور نٹراجن تینوں کمپاونڈ میں بھاگنے لگے۔ کچھ دیر بعد انہیں کتا کمپاؤنڈ کے ایک گوشہ میں بے چینی کے عالم میں نظر آیا۔ ورما نے اندازہ لگایا کہ وہ پیشاب کرنے کیلیئے بے چین ہے اور کسی کھمبے کی تلاش میں ہے۔ نٹراجن اُسے فوری پکڑ لینا چاہتا تھا لیکن ورماجی نے تجویز پیش کی کہ وہ اپنے پیر کو کھمبے کی طرح کھڑا کردینگے اور پیشاب کرنے کے بعد کتے کو پکڑ لینگے۔ تینوں میں اس بات کو لے کر بحث ہونے لگتی ہے کہ کتے کو پیشاب کرنے دیا جائے یا ویسے ہی پکڑ لیں۔ ورماجی اور نٹراجن کی لڑائی میں نٹراجن کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ اس دوران سارے دفتر میں ڈائرکٹر کے کتے کے چھوٹ جانے کی خبر پھیل گئی اور سب ہی ملازمین کتے کو پکڑنے کی کوشش میں لگ گئے۔ کتے نے ورماصاحب کی پینٹ کا ایک پائنچہ پھاڑ ڈالا۔ کتا کمپاؤنڈ سے بھاگ کر ریسپشنسٹ کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ہمیشہ مسکراتے رہنے اور میک اَپ میں مصروف ریسپشنسٹ (Receptionist) ڈر کر ٹیبل پر چڑھ گئی۔ کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مسکراتی رہی تا کہ کتا اُس کی مسکراہٹ کے سحر میں ڈوب جائے اور لوگ اُسے پکڑ لیں۔ کتا وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا

اور ایڈمنیسٹریشن سکشن پہنچ گیااوروہاں سے ایک ضروری فائل اپنے دانتوں میں دبائے بھاگا۔لیکن فائل کوڈائرکٹر کے پاس پہنچانے کا جملہ سن کر فائل وہیں چھوڑ دیااورسبھاش بگائی کاٹفن لے کر بھاگا۔سبھاش کوٹفن میں چھپی اپنی عزت کی فکر ہوئی کہ کہیں لوگوں کے سامنے اس کا بھرم نہ کھل جائے کہ ٹفن میں صرف ایک روکھی سوکھی روٹی ہوا کرتی ہے۔

کتا بھاگ کر محافظ خانے میں پہنچ گیا۔وہاں کا انچارج رحمت علی جو ہر وقت سوتا رہتا تھا اب بھی سو رہا تھا۔لوگوں نے اُسے نیند سے جاگ جانے اور کتے کو پکڑ لینے کی دہائی دی۔اس پر رحمت علی نے کہا کہ کتا یہاں بالکل محفوظ رہے گا فکر نہ کرو۔اور میں کتے کونہیں پکڑوں گا کیونکہ میں کل ریٹائر ہورہاہوں اور میری قسمت اس کتے سے بہت آگے نکل چکی ہے۔

ورماجی نے آخری کوشش کے طور پر کتا کو پکڑنا چاہا لیکن نٹراجن نے انہیں پیچھے کھینچ لیا۔اس دوران شوروغل کی آوازیں سن کر ڈائرکٹر خود اپنے چمبر سے باہر نکل آیا اور دیکھا کہ سارا عملہ اُس کے کتے کو پکڑنے کی کوشش میں لگا ہواہے۔ڈائرکٹر نے اپنے کتے کو آواز دی اور کتا فوراً ہی، ڈائرکٹر کے قدموں میں لوٹنے لگا اور ڈائرکٹر نے اُسے پکڑ کر اپنی کار میں بٹھا دیا اور ایسا محسوس ہورہا تھا کہ تمام ملازمین کی دُمیں ہل رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد ورماجی کو اطلاع ملی کہ اُن کی پرموشن نہیں ہوگی پرانی تنخواہ میں ہی انہیں نئی پتلون سلانی پڑے گی۔نٹراجن کے خلاف خرد برد کے الزامات

ثابت ہوجانے کی اطلاع دی گئی۔دوپہر میں کینٹین میں ورما اورنٹراجن کی ملاقات ہوئی تودونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگ گئے اور اُن کے بیچ سے ڈائرکٹر کا کتاب غائب تھا۔

غرض مجتبیٰ حسین نے اپنے اس مضمون کے ذریعہ جہاں آفس کے بڑے عہدہ داروں کی خوں خواری اور رعب ودبدبا کی عکاسی کی ہے وہیں اُن سے متعلق چیزوں کی اہمیت کا بھی بڑاخوبصورت نقشہ کھینچاہے جیسے پرسنل اسسٹنٹ، کتاوغیرہ کا۔اب سب سے اہم نکتہ اس مضمون کا یہ ہے کہ نااہل اور بے ایمان، نکمّے ملازمین اپنے کام سے ڈائرکٹر کومطمئن کرنے کی بجائے کتے کوپکڑکراپنی کارکردگی ثابت کرنے اور بے ایمانی کوچھپانے یااُس داغ کومٹانے کیلئے چھچھوری حرکتوں پراُتر آتے ہیں جیسا کہ ورما اورنٹراجن نے کیا۔ ہروقت ملازمت کے دوران سوکروقت گزارنے والا رحمت علی اور بے وقت مسکراتے رہنے اور میک اپ میں مصروف رہنے والی ریسپشنسٹ آج کے دور کے نکمّے ملازمین کی نمایندگی کرتے ہیں۔

سوال(2) مجتبیٰ حسین کے بارے میں اپنی معلومات کااظہار کیجیے۔

جواب: مجتبیٰ حسین 15 / جولائی 1936ء کوگلبرگہ میں پیداہوئے۔ والدکانام مولوی احمدحسین تھا۔مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تعلیم گھرپرہوئی۔گلبرگہ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعدتانڈور سے میٹرک کامیاب اورگلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ پھر 1956ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔طالب علمی کے دور

میں ایک حرکیاتی طالب کی حیثیت سے مشہور تھے کالج کی علمی وادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے۔ ڈراموں میں بھی حصہ لیا کرتے۔ انہوں نے ایک یادگار مشاعرہ کا بھی انعقاد عمل میں لایا تھا جس میں اس دور کے مشہور شعراء نے شرکت کی تھی۔ 1962ء میں محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ کے اردو شعبہ سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ 1972ء میں گجرال کمیٹی کے شعبہ تحقیق میں بھی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ 1974ء میں نیشنل کونسل آف ایڈوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے 1993ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین کے دو بڑے بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس نے بھی اردو صحافت، طنز ومزاح اور فکشن میں نام کمایا۔

مجتبیٰ حسین اردو کے ممتاز ومعروف طنز ومزاح نگار اور صحافی کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے 20 سے زاید کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں خاکے، انشائیے، خودنوشت، کالم اور سفر نامے وغیرہ شامل ہیں۔ ''اردو کے شہر میں اردو کے لوگ، بہرحال، قطع کلام، سفر لخت لخت، میرا کالم، خودنوشت، اپنی یادیں'' اُن کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان کے سفر نامے ''جاپان چلو جاپان'' کافی مشہور ہے اور اس کا ترجمہ جاپانی زبان میں ہوچکا ہے۔ ان کی تحریریں دنیا بھر میں پسند کی جاتی ہیں۔ اور ہندوستان کی کئی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوچکے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی خدمات کے اعتراف میں ہندوستان کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک میں جلسے منعقد کئے گئے اورانہیں انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا۔

حکومت ہند نے انہیں 2007ء میں پدم شری کے اعزاز سے بھی نوازا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیارکرلی ہے اور 81 سال عمر ہونے کے باوجود اب بھی ادبی جلسوں میں شرکت کرتے ہیں اور اپنی بذلہ سنجی سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور کارناموں پرعثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ایک طالبہ نے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔





DECCAN TRADERS
Educational Publishers
23-2-378, Moghalpura, Hyderabad-500 002
Ph : 040-24521777, 66490230, Fax : 66710230
Website : wwwdeccantraders.co.in
E-mail : dthyd@yahoo.com

₹.80/-